

.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، نمٹک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبہر“ نے بین الاقوامی پرائز حاصل کی، تو جنگ، سبزے، نیگرن میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے ترفہٴ حسین کا درجہ دی ہے۔ نواز، نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدر رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قد رے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے غیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زور پرست دنیا کے آن گشت بد صورت رویوں، بد ہیئت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا چاہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سبزے نیگرن“ روزنامہ جنگ، شعبہ نیگرن، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

روی کہتا ہے کہ ”تمہارا مقصد محبت کی تلاش میں بھٹکتا نہیں..... تمہیں تو بس ان تمام رکاوٹوں کو کھوجنا ہے، جو تم نے خود اپنے اندر اس محبت کے خلاف کھڑی کر رکھی ہیں۔“ میں بھی شاید اپنے اندر کی رکاوٹیں کھوج لیتا، اگر مجھے مزید کچھ دیر اس بے ہوشی کے سمندر میں غرق رہنے کا موقع مل پاتا مگر کوئی مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ”پری زاد، ہوش میں آؤ..... ہم یہاں سے کوچ کر رہے ہیں.....“ میری چند ہیائی آنکھوں نے فیروز خان کا ڈھنڈلا سا پیولا دیکھا، جو مجھ پر ٹھکا مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، چند لمحوں کی فسادگی کے بعد میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں انگلی میں اپنے کمرے کے بستر پر تھا۔ فیروز نے میرا چہرہ تجھپایا۔ ”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم سب کچھ دن کے لیے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ جہاز سے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے۔ ہم لوگ باہر گاڑیوں کے قریب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، دو پہر کی تیز صوب ڈھل رہی تھی۔ مطلب میں پورا دن بے سندھ پڑا رہا تھا۔ میرے سر میں ابھی تک درد سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو مٹی بندھی ہوئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہی مجھے ایک زوردار چکر آیا اور میں نے جلدی سے پینک کی پائنتی کو پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک سرخ اور سیاہ دائرے آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے اور پھر میں اپنے ڈولتے قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا باہر نکل آیا۔ پورچ میں تقریباً سبھی گاڑیاں روگائی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ سارا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یہ عمارتیں یکینوں کے چٹا کتنی ویران ہو جاتی ہیں۔ شاید انسان دنیا کا سب سے بڑا ساحر، جادوگر ہے، لوگوں کو تو اپنا عادی بناتا ہی ہے، مگر، دیواریں اور مکان بھی اس کے سحر سے بچ نہیں پاتے۔ میرے گاڑی میں بیٹھے ہی فیروز نے گاڑی آگے بڑھا دی اور باقی ساری گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے چل پڑیں۔

”مالک کہاں ہیں.....؟“ فیروز میرا سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہا۔ ”وہ وہیں گھر پر ہیں گے تین دن۔“ مالک کے سوئم کے بعد ہم بھی وہاں پہلے جا کیں گے گھر.....“ میرے اندر کوئی دل نما چیز بہت زور سے ٹوٹی۔ بڑے زور کا چھٹا ہوا۔ ایک ہلکی سی آس، جو میرے سینے میں کسی چھانسی کی طرح ابکی ہوئی تھی، فیروز نے ایک جھٹکے ہی میں اسے کھینچ کر باہر نکال دیا۔ کچھ تیر، جن کے دھوم سے آگے کی جانب سے باہر کمرے ہوتے ہیں، ان کا جسم میں پیوست ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا، جتنی اذیت ان کو جسم سے باہر کھینچنے کا لئے میں ہوتی ہے۔ جانے میں کیوں یہ امید لگے بیٹھا تھا کہ بہروز کریم نے لیلیٰ کو معاف کر دیا ہوگا۔ مگر افسوس ہماری آس اور امیدیں اکثر دھادے جاتی ہیں۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ رات کو تہی پولیس اسٹیشن میں بہروز کے ذرا نیور نے رپورٹ درج کروائی کہ جیسے ہی اس کی مالکین لفٹ سے باہر نکلی، ایک نو جوان نے اس پر حملہ کر دیا اور نو جوان کے پستول سے لگی گولی مالکین کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ ذرا نیور کی جوانی گولی سے نو جوان بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیلیٰ کے سینے میں پیوست گولی، جس پستول سے لگی تھی، وہ ہٹا لائیں تھا اور نو جوان کے ہاتھ میں دبا پایا گیا تھا۔ ذرا نیور کا پستول لائسنس والا تھا، جو اس نے رپورٹ کے ساتھ ہی تھانے میں جمع کر دیا۔ اور اس وقت ذرا نیور پولیس کی حراست میں تھا۔ بہروز نے ہم سب کو احتیاطاً محل سے منتقل کر دیا تھا، تاکہ ہم میں سے کوئی پولیس کی نظروں میں نہ آ سکے۔ پولیس اس بات کی تفتیش میں لگی تھی کہ آخر مرنے والے اس نو جوان کا مقصد کیا تھا۔ بہروز نے پولیس کے سامنے شک ظاہر کیا تھا کہ مرنے والے ولید کا تعلق اس کے مخالف کاروباری طبقے سے ہو سکتا ہے۔ بہر حال، جو کچھ بھی تھا۔ یہ تفتیش اب لمبی چلنے والی تھی، مگر میں ان سب باتوں سے لائق اپنے آپ میں گم بیٹھا صرف لیلیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیلیٰ صبا نے ایسا کیوں کیا۔ یہ محبت تو انسان کو جان لیوا حد تک نڈر بنادیتی ہے، آخر کس چیز کی کمی تھی لیلیٰ کو۔ کُسن، بصورت، شکل، دولت، مرتبہ اور عزت..... کیا محبت ان سب نعمتوں سے الگ، کچھ سوانحی ہے؟ شاید محبت کی ضروریات اور محبت کی دنیا ہماری ان سب عارضی خواہشات اور دکھاوے کی دنیاؤں سے بہت بلند، بہت جدا ہوتی ہے۔ ہم ایک جتنے تک کسی اور کوشش میں منتقل بلکہ مقید رہے۔ پابندی اور اکتاہٹ گزرتے وقت کو بہت طویل بنا دیتی ہے، مگر جیسے جیسے وہ ایک طویل ترین ہفتہ بھی گزری گیا۔

آٹھویں دن ہم پھر سے بہروز کے محل میں تھے مگر بہروز اب وہ بہروز نہیں تھا، جسے میں نے آٹھ دن پہلے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں کی ویرانی اور وحشت دیکھ کر میں اندر سے لرز سا گیا، وہ نیپ چاپ سا اپنی خواب گاہ کی بالکونی (ٹیرس) میں بیٹھا اور غلامیں گھور رہا تھا۔ ”آگے تم لوگ..... اچھا کیا، مگر اب کچھ دن تک ذرا محتاط رہنا، معاملہ تازہ ہے.....“ فیروز سر ہلا کر باقی ساتھیوں سمیت پلٹ گیا، مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور تجانی پاتے ہی ان سے براہ راست پوچھ لیا۔ ”آپ نے انہیں مار کیوں دیا، آپ تو ان سے بہت محبت کرتے تھے، پھر.....؟“ بہروز اب بھی گم سم تھا ”محبت کرتا تھا، تب ہی تو مار ڈالا.....“ میری آواز نہ چاہے ہوئے بھی بلند ہو گئی۔ ”مگر کیوں؟ آپ انہیں طلاق دے کر فارغ بھی تو کر سکتے تھے۔ جان بخشی بھی تو ممکن تھی ان کی۔ آپ کے ساتھ نہ کسی، مگر کم از کم وہ زندہ تو رہتیں۔“ بہروز نے میری طرف دیکھا۔ میری نظر ٹھک گئی۔ ”اتنا طرف نہیں تھا مجھ میں پری زاد..... کبھی کبھی محبت ہمیں بہت خود غرض، بڑا کم ظرف بنا دیتی ہے۔ یہ جو لوگ محبت میں قربانی، ایثار اور باث دینے کے فلسفے کی باتیں کرتے ہیں، یہ سب کچھ اس ہے، جوٹ بولتے ہیں سب۔ محبت، شدید نفرت سے بھی زیادہ کمینہ اور خود غرض جذبہ ہے اور جن کی محبت میں لالچ، خود غرضی اور سب کچھ پالینے کی ہوس نہیں ہوتی، سمجھو، ان کی محبت میں ہی راکھوٹ ہے۔“ بہروز نے آج پہلی بار مجھ سے یوں محفل کر بات کی تھی یا پھر شاید آج اسے دل کی بات سنانے کے لیے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ ہم زندگی میں اپنے دل کی بہت سی باتیں اس لیے نہیں کر پاتے، کیوں کہ ہمیں اپنے معیار کا سامع نہیں ملتا۔ میری آواز نوت

نوٹ کر نکل رہی تھی۔" تو پھر مجھے کیوں غصہ دیا آپ نے۔ میرا جرم بھی تو کچھ کم نہیں تھا۔ مجھے بھی وہیں مار ڈالتے۔" بہروز اب بھی جس وحشت بھرا رہا۔ "ہاں، تمہیں بھی مار دیتا اسی وقت۔ بس تمہاری آخری خواہش نے ہاتھ روک دیا میرا۔ کیوں خود سے اسی آخرت کرتے ہو؟ مرد کی شخصیت صرف اس کے چہرے سے مکمل نہیں ہوتی۔ یہ سب لوئر ڈل کلاس طبقے کی عمر و میاں ہیں۔ مرد دولت، اختیار، طاقت اور تہ سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ چہرہ، وجاہت وغیرہ فنی ستاروں کی ضرورت ہے۔ سپنوں کے شہزادے صرف ناؤز میں پائے جاتے ہیں۔ اصل دنیا تمہارے چہرے سے کہیں زیادہ کرخت ہے پڑی زاد۔" میں چپ چاپ کھڑا انتظار رہا۔ یہ بات کبھی مجھے لپٹی کی ماں نے بھی کہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی بہروز کو کچھ یاد آگیا۔ "ہاں، مگر تمہیں خود غلطی کا اتنا شوق کیوں ہے۔ تم جانتے تھے کہ وہ عورت تمہاری جان کے ذریعے ہے اور سارے الزام تمہارے سر ڈال کر اپنی آلی قضا تمہارے غصے منتقل کرنا چاہتی ہے، پھر بھی تم نے اس کے لیے جھوٹ بولا، کیوں؟" "اس لیے کہ میں آپ کے نوکر اور دیگر عملے کے سامنے آپ کے گھر کی عزت کو سونپ دینا چاہتا تھا۔ مجھے لپٹی لگن نے بیٹھ بیٹھ بتایا کہ وہ اپنی کھلی یار شے داروں سے ملنے جاتی ہیں، اپنی تمہائی سے گھبرا کر۔ ورنہ میں کبھی آپ سے نہ ٹھٹھا پاتا۔" بہروز نے ایک گہری سانس لی۔ "میں جانتا ہوں، اس کے لیے تمہیں بے وقوف بنانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بہر حال، تم نے اپنی زندگی کے بدلے میری عزت بچانے کا سوچا۔ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہاری ذمہ داریاں آج سے بدل دی گئی ہیں۔ جاتے ہوئے فیروز سے ملنے جانا اور ہاں اب تم انکیسی ہی میں رہو گے۔" بہروز کے کمرے سے نکل کر میں انکیسی میں واپس آ گیا۔

اگلے روز فیروز نے مجھے ایک آرامستہ دفتر میں پہنچا دیا۔ "یہ آج سے تمہارا دفتر ہے، مالک نے تمہیں منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی ہے۔ باہر بیٹھا علمہ تمہیں سارا کام سنبھالے گا۔ یہ ہماری سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا دفتر ہے اور یہ سارا عملہ آج سے تمہارے ماتحت ہوگا۔" میں حیرت سے فیروز کو دیکھتا رہا۔ فیروز نے میرے چہرے پر لکھے سوال پڑھ لیے اور مسکرا کر بولا "تم بہت جذباتی ہو۔ مگر وفادار ہو۔ اور مالک وفاداروں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ تمہیں اب کچھ عرصے تک اسی کمپنی کا کام دیکھنا ہوگا، کیوں کہ میں ڈر ہے کہ تمہاری جذباتیت کسی بھی موڑ پر ہمارے لیے کوئی نیا کھینچا کر کھڑا کر دے، لہذا فی الحال تمہیں کسی خطرے والے منصوبہ میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ ویسے بھی دہلی کی پولیس اب چوبیس گھنٹے ہم سب پر نظر رکھ رہی ہے۔ یہاں کا قانون سب کے لیے یکساں اور بہت سخت ہے، تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔" فیروز اپنی بات ختم کر کے چلا گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا اس عالی شان دفتر اور بڑی سی میز کے پیچھے رہی اس چمکتی سیاہ کرسی کو دیکھتا رہا۔ کل کی ایک غریب بستی کا پڑی زاد آج دہلی کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا منیجر تھا۔ میں نے کرسی کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بیٹھ کر تین چار مرتبہ اسے گھما کر بارہویں منزل پر واقع اپنے دفتری بڑی بڑی شمشے کی کھڑکیوں سے دہلی شہر کی گہما گہمی کا نظارہ کیا۔ اُس روز مجھ پر ایک اور صدیوں پرانہ تاریخی منکشف ہوا کہ ان اونچی آسمان سے بائیں کرتی عمارتوں کے کمروں میں بیٹھے لوگوں کو زمین پر چلتے عام انسان اتنے چھوٹے، حقیر اور کڑے کوڑوں جیسے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرے دن رفیق اچانک ہی بتاتے کسی کام سے دہلی آ گیا، اور عملے سے پوچھتے پوچھتے ٹیکسٹری کے دفتر تک آ پہنچا۔ مجھے منیجر کی کرسی پر بیٹھ کر دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو وہ کچھ کہنا ہی بھول گیا۔ میں نے چڑا سی سے چائے یا کافی لانے کے لیے کہا اور رفیق کو ہاتھ سے پکڑ کر سامنے صوفے پر بٹھا دیا۔ "اب کچھ کہو گے بھی یا یوں ہی گم سم بیٹھے رہو گے؟" رفیق نے ایک ہی سانس میں پانی کا پورا گلاس طاق سے نیچے اٹھ لیا۔ "پڑی زاد پیارے..... سچ بتاؤ، تم کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہے، جو تم مجھے اور باقی دنیا کو بتا نہیں سکتے۔" میں نے گہری سانس بھری "نہیں، میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا، جس کے بارے میں مجھے تم سے یا کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش آئے۔" مگر میرے جواب سے رفیق کی حتمی نہیں ہوئی۔ "دیکھو پڑی زاد! میں جانتا ہوں کہ بہروز مالک کے ہاں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے، جس کی ہمیں بھی خبر نہیں۔ اگر خود کو کسی ایسی گمراہ میں الجھا بیٹھے ہو تو ابھی بھی وقت ہے، میں تمہیں چپ چاپ دہلی سے پار کر دے سکتا ہوں، ایک دو دوست ہیں میرے لانچ والے۔ کسی کو تمہارے فرار کی خبر بھی نہیں ہوگی۔" میں نے مسکرا کر اپنے اس نادان دوست کی طرف دیکھا۔ "مجھے صرف خود اپنے آپ سے فرار چاہیے۔ یوں خود مجھے اپنے آپ سے فرار کروا سکتے ہو.....؟ ہے کوئی ایسی لانچ، بخری جہاز یا اڑن کھنولہ، جو مجھے خود میری ذات کے جزیرے سے فرار کر دانے میں مدد کر سکے.....؟" رفیق کی ہلکی سی ہنسی اور پھر وہ زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہیں سکا۔

میرے دن اور رات بھر سے اسی ایک سائیت کا شکار ہونے لگے، جس سے میں ہمیشہ ہی بے زار رہتا تھا، البتہ پیانو سے دہلی پلٹی ہوئی تھی۔ لپٹی کی موت کے بعد مار تھا نے نکل میں آنا بند کر دیا تھا، مگر اب میری انگلیاں اپنی مرضی کی ڈھنسی بکھیرنا خوب جانتی تھیں۔ بہروز کریم بھی اب زیادہ تر گھری پر رہتا تھا، خاموش، کھو یا کھویا، افسردہ سا..... اُس شام میں ایک ضروری فائل پر اس کے دستخط لینے اس کے پاس پہنچا، تو وہ کہیں جانے کی تیاری میں دکھائی دیا۔ "آپ کہیں جا رہے ہیں مالک؟" "ہاں، کچھ دن کے لیے اس کی یادوں سے فرار کی ایک کوشش کر دیکھتا ہوں، حالاں کہ کہیں نہ کہیں اندر سے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بے کار جائے گا۔" بہروز شام کے جہاز سے لندن فلائی کر گیا اور میں رات گئے تک یہ سوچتا رہا کہ ہم انسان سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ رشتے ناتے دوستیاں، دشمنیاں، مذہب اور حتیٰ کہ اپنے خدا کو بھی، تو پھر صرف ایک محبت کی یاد کو اپنے دل سے مٹا کیوں نہیں پاتے۔ کاش یہ مقدر انسان کو اور کوئی اختیار نہ دیتا صرف یادیں بھلانے کا اختیار نہ دیتا۔

میری توقع کے مطابق بہروز زیادہ دن باہر نہیں جاسکا اور ٹھیک دو ہفتے کے بعد واپس آ گیا۔ مگر اس کی واپسی کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا، جب فیروز نے مجھے خبر دی کہ اس جرم کو جو ان ولید کا باپ انتہائی اثر و رسوخ والا ہے اور وہ بہت جلد دہلی پہنچ کر لپٹی جیسا ہوا اپنے بیٹے کے قتل کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش شروع کر دانا چاہتا ہے اور پھر ٹھیک تین دن بعد پولیس کی بہت سی گاڑیاں بہروز کریم کے گھر کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئیں اور ایک بار پھر ہم سب سے بیانات لیے گئے۔ بہروز کے چہرے پر حسب معمول کوئی تاثر نہیں تھا، مگر فیروز مجھے کافی پریشان دکھائی دیا۔ رات کو بہروز نے ہم سب کو کھل کے بڑے ہال میں میٹنگ کے

لیے بلایا اور پُرسکون لمبے میں بتایا کہ دہلی پولیس نے کیس پھر سے کھول لیا ہے، اور ڈرائیور جس کی ضمانت ہو چکی تھی، اسے بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے، لہذا اس کے ذاتی عملے کو آج کے بعد کھلی اجازت ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے جو جہاں لٹکنا چاہے، نکل جائے، اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے دن بہت سخت ہوں، کیوں کہ دہلی پولیس بہت عرصے سے اس موقع کی تلاش میں تھی کہ انہیں بہروز کے خلاف کوئی شکایت موصول ہو، تو وہ سارے گزے مردے ایک ساتھ ہی اکٹھا کرنا شروع کر دے، کیوں کہ اب تک بہروز اتنا محتاط رہا تھا کہ سب جانتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو صرف میں اور فیروز وہاں بکے، باقی تمام ممبرز نے حسب توقع جانے سے پہلے اپنا آخری فیصلہ بہروز کو سنا دیا کہ وہ ایسے مشکل وقت میں

بہروز کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ واقعی، بہروز نے اپنے ارد گرد دہشت مچائی کر لوگ صبح کیے تھے۔ فیروز نے ان کے جانے ہی روز وار دیندہ کیا اور پریانی سے بولا "ہم سب ہمیں رہیں گے، مگر آپ کو فوراً یہاں سے کسی اور ملک نکل جانا چاہیے۔ ان حالات میں بھارت یا پاکستان ہی بہتر رہے گا۔" میں آج رات ہی بڑی لانچ تیار کروا دیتا ہوں۔ سمندر میں ہمارے وفا داروں کی کئی نہیں، دو راتوں کے بعد آپ کسی محفوظ مقام پر ہوں گے۔"

بہروز نے اطمینان سے فیروز کی پوری بات سنی۔ "کبھی کبھی روپوشی انسان کو مزید ظاہر کر دیتی ہے فیروز خان..... تم بڑی زود کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ۔ اُس کے ہاتھ ابھی صاف ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے بھی دوسروں کی ساتھ شامل کر کے دھریا جائے۔" بہروز کریم کا لہجہ جتنی تھا۔ فیروز ہاؤس ساواہاں سے پلٹ گیا، میں نے بھی وہاں ہی کے لیے قدم بڑھائے تو میرے عقب میں بہروز کی آواز گونجی۔ "جب کوچ کا وقت آئے تو خدمت کرنا، چلے جانا۔" میں نے پلٹ کر جواب دیا "آپ جانتے ہیں، آپ ہمیں قانون میں مقرر سزا سے بھی بڑی سزا دے رہے ہیں۔" بہروز نے سگار کا ایک لمبا ساشل لیا اور ایک ٹیک میز پر جانب بڑھایا۔ "اسے رکھو، نئے وقت میں کام آئے گا۔ اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اپنے آپ کو اتنا حقیر مت جانو، یہ دنیا میں ہے ہوئے کو مزید مارتی ہے، مگر جو دین تان کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اسے لگا کر دے، اُسی کو سلام کرتی ہے، دنیا کو لاکھ کرنا سیکھ لو بڑی زاو..... محبت زندگی کی پہلی یا آخری ضرورت نہیں ہوتی اور تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس دل کے بھلائے کو یہ ایک عذر تو موجود ہے کہ کسی کی محبت تمہارا مقدر رہی نہیں۔ مسئلہ تو ہم جیسوں کا ہے، جو محبت پا کر خود اسے اپنے ہاتھوں سے کھود دیتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اکثر تم پر رشک آتا ہے کہ کاش تمہاری طرح میں بھی غر بھراس عذاب سے محروم رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔" میں نے حیرت سے بہروز کی طرف دیکھا۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔"

پلی صبا کے قتل کی تفتیش کا دائرہ تیزی سے ہمارے گرد گھم جاتا تھا۔ میں نے فیروز سے بہروز کریم کو دہشتی سے نکال کے جانے کی ایک آخری کوشش کرنے کو کہا۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ اب شاید یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہ ہو، کیوں کہ اس کی اطلاع کے مطابق پولیس نے محل کے ارد گرد راستوں کی گنگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ فیروز نے ایک حقیقی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم سب نے نل کر کسی نہ کسی طرح بہروز کریم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ٹھیک تین دن بعد ہم سارے کارندے مع بہروز، دو بڑی لالچوں میں بنگا کی سی اور جانب نکل جائیں گے۔ ہمارے چہروں پر کچھ فیصلہ پڑھ کر بہروز مجھ گیا کہ ہم سے مزید بحث بے فائدہ رہے گی۔ فیروز خان کو ایسے معاملات کی گنگرانی کا اندازہ اور ان سے نمٹنے کا طریقہ خوب آتا تھا۔ اس نے ہمارے فرار والی رات ہی محل میں بہروز کی سالگرہ کا جشن اور پارٹی منعقد کرنے کا ذمہ سونپ دیا اور دوسرے تمام کریموں کو دعوت نامے بھی ارسال کر دیے گئے۔ طے پایا کہ شام کو اندھیرا ڈھلتے ہی جب مہمانوں کی آمد شروع ہونے والی ہوگی، فیروز خان، بہروز اور دیگر چند کارندوں کو لے کر پہلی لانچ پکڑ لے گا۔ جب تک میں اور دیگر ملہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہیں گے اور موقع ملتے ہی ہم بھی نکل جائیں گے۔ تیسرے دن شام ہی سے محل میں ہل چلی سی گئی۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ پہرہ کافی سخت ہے، اس لیے انہیں اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے فیروز کے سامنے ایک بیٹھ کی آرمائی ہوئی ترکیب تجویز کی۔

فیروز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، یہ جو ابھی کھیل لیتے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، مگر پھر تمہارا یہاں سے جلدی نکلنا شاید ممکن نہ ہو۔"

بہروز ابھی اپنی خواب گاہ میں تھا۔ میں نے اس کے ذرا نیچے کو بہروز کی خاص گاڑی لگانے کو کہا اور گھر سے نکلنے ہوئے لاؤنچ میں پڑے بہروز کے سگار کیس سے ایک سگار اٹھالیا۔ ڈھلتے اندھیرے میں جب بہروز کی کار محل سے باہر نکلی تو میں ایسے زاویے کے ساتھ ہاتھ میں سگار لیے کچھل سیٹ پر بیٹھا تھا کہ پہلی نظر میں باہر سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کار میں بہروز بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ محل کے دربانوں نے بھی کھٹ سے سلام بڑ دیے۔ شاید ہم لوگوں سے کہیں زیادہ، ان کے معمولات سے مانوس اور آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری ذاتی اشیاء، اوقات کار اور عادات ہماری پہچان بن جاتے ہیں اور خود ہم اس پہچان میں کہیں کھو سے جاتے ہیں۔ بہروز کی مخصوص کار کے محل سے نکلنے ہی ایک سیاہ رنگ کی بڑی چوکی جیب ہمارے تعاقب میں چل پڑی۔ ہمارا پرانا طریقہ شاید ابھی تک کارآمد تھا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار بڑھانے کو کہا اور ہم تین چار گھنٹے تک دہشتی کی سڑکوں پر ادھر سے ادھر بے مقصد کار دوڑاتے رہے۔ تعاقب میں آنے والی جیب کو ہم نے برابر یہی تاثر دینے رکھا، جیسے ہم اس کے تعاقب سے جان بچھرانے کے لیے بار بار کار کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ پرانی انگریزی جاسوسی فلموں میں، میں نے ایسے مناظر بار بار دیکھے تھے، مگر تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی میں بھی یہ مناظر حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ شاید قدرت انسانی ذہن کی اڑان وہاں تک رکھتی ہے، جہاں تک اس جہان کا تمام میں ممکنات کی حد ہو۔ ورنہ یہ مصنف، رائٹر اور قلم کار وہ سب کچھ کیسے سوچ اور لکھ لیتے ہیں، جو کبھی اُن کے ساتھ پیش ہی نہ آیا ہو۔ یہ تخیل کیا بلا ہے، جو انہوں کو کبھی ہونی کر کے لکھتا ہے۔ مگر میرا پیچھا کرنے والی جیب میرا تخیل نہیں تھی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ بہروز کریم اور دیگر ساتھی محل سے نکل کر ساحل تک پہنچ گئے ہوں گے، تب میں نے ڈرائیور کو گاڑی کی طرف موڑنے کو کہا۔ میری توقع کے مطابق فیروز خان ان سب کو لے کر نکل چکا تھا۔ مہمانوں کی جھپٹنے سے کار اندر آتے دیکھی تو سب ہماری طرف لپکے۔ میں نے یہ مشکل ان سے معذرت کی کہ بالک کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ لوگ تب تک عشاء تک تناول فرمائیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان مہمانوں میں سے کچھ کا تعلق قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی ضرور ہوگا، مگر مجھے بہر حال ان کا یہ بھرم آخری وقت تک سمیٹے رکھنا تھا کہ بہروز ضروری کام نہ سنا کر آتا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں، تنہائی آس پاس لوگوں کی غیر موجودگی کا نام نہیں، ہمارے آس پاس موجود انسانوں میں ہماری غیر دل چسپی ہمیں تنہا کرتی ہے۔ میں بھی اس پارٹی کے جھوم میں تنہا کھڑا محفل برخواست کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہا۔ پھر چائے گل کے گیت پر بہت سی گاڑیوں اور مخصوص سائرن کا ایک شور مچا اٹھا۔ چند لمحوں بعد دہشتی پولیس کا ایک بڑا فرمیر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انداز اس کے عہدے سے کہیں زیادہ کمانڈر تھا۔

"تمہارا مالک بہروز کریم کہاں ہے.....؟" "بس آتے ہی ہوں اس کے مالک۔" "اس شخص کو عربی لہجے کی انگریزی میں گرجا۔" ہمارے پاس اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "جب وہ وہاں آئیں تو گرفتار کر لیجئے گا۔" "مہمان یہ سارا معاملہ دیکھ کر دھیرے دھیرے جھٹکے لگے اور پھر کچھ دیر بعد اس افسر کا تحت باہر سے بھاگتا ہوا انداز آیا اور اس نے افسر کے کان میں کچھ کہا۔ افسر کی ہنسنی سنیں اور وہ غصے میں میری طرف پلٹا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھرا آئی۔" "میرے پاس تمہارے لیے ایک بڑی خبر ہے....."

بائیں ہم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، منسلک کے معروف و منفرد رامارائز، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سبزے، نیگورین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ ثانی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زا“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز ہی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زور پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رونوں، بدایتے آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا چاہا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سبزے نیگورین“ روزنامہ جنگ، شعبہ نیگورین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرا دل زور سے دھڑکا، اس پولیس افسر نے مڑ کر اپنے ماتحت سے عربی میں کچھ کہا اور پھر میری طرف پلٹا ”میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں، تمہارا مالک اور دیگر ساتھی پہلے ہی پکڑے جا چکے ہیں۔ فی الحال، تم پر کوئی واضح الزام نہیں، مگر شک کی بنیاد پر حراست میں لیا جا رہا ہے۔“ کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ دیر نہیں لگتے، شاید ہمارے اندر ابھرتے خوف اور وہم کا تقدیر اور پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہ راست رشتہ ہوتا ہے، اسی لیے جب مجھے گرفتار کر کے لاک اپ پہنچایا گیا، تو میں نے اپنے خدشات کے عین مطابق بہروز کریم، فیروز اور دیگر عملے کو مختلف چھوٹے چھوٹے حالات نما کمروں میں بند پایا۔ بہروز کے قانونی مشیروں اور چوٹی کے وکلاء کی ٹیم بھی پولیس حکام کے ساتھ بحث کرتی نظر آئی۔ مجھے بھی ایک لاک اپ میں دھکیل دیا گیا، اور میں اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ انسان کی ساری بے چینی اور بے قراری اُسی وقت تک ہوتی ہے، جب تک اختیار اس کے ہاتھ رہتا ہے، جب فیصلوں کے مختار دوسرے ہو جائیں تو پھر اک اُن جانا سازگون اور ضمیر آؤ جیسے سارے وجود کی بے چینی سمیٹ لیتا ہے۔ میرا فیصلہ بھی اب میرے صیادوں کے ہاتھ تھا، پھر مجھے بھلا کا ہے کی فکر ہوتی۔ اگلے روز ہمیں عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ایک چھوٹے سے ہال نما کمرے میں جمع کیا گیا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسب معمول شگون تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”کہو پری زا! نیند کبسی رہی؟“ کہتے ہیں مشکلات سے دور بھاگ کر ہم صرف اس مصیبت کے حل سے اپنا فاصلہ بڑھا رہے ہوتے ہیں، مگر نہ مشکل تو ہمارے ساتھ ہی چل رہی ہوتی ہے۔ بہروز کے وکلاء نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، مگر اس کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ رات کو جب لاک اپ میں سنا چھا گیا، تو میں نے ساتھ والے لاک اپ کی دیوار پر دھیرے سے دستک دی ”آپ سوتو نہیں گئے مالک.....؟“ کچھ دیر بعد بہروز کی آواز گونجی ”کسی سوتے ہوئے سے یہ بڑا عجیب سوال ہوتا ہے؟“ میں نے ایک گہری سانس لی ”معذرت چاہتا ہوں مالک، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل عدالت میں قاضی کے سامنے مالکن کے قتل کا اعتراف کر کے جرم اپنے سر لے لوں گا، آپ میرے اعتراف کے بعد کوئی اعتراض نہ کریں، تو میرا بانی ہوگی۔“ بہروز نے کچھ دیر توقف کیا، پھر اس کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری ”بہروز کریم اتنا ہی بوجھ لاتا ہے، جتنا وہ دھوکے تمہارے اس احسان کا بوجھ بہت بھاری ہے بڑی زور، اور ویسے بھی ولید کا باپ اس کی لیلیٰ سے پرانی رفاقت کے سارے ثبوت لے کر آیا ہے، تم پر یہ قتل ڈال بھی دیے جائیں تو دوسری طرف کا کوئی بھی اچھا وکیل بہت جلد جج کی تہہ تک پہنچ کر اسے عدالت کے سامنے پیش کر دے گا۔ میں نے زندگی میں بہت جرم کیے ہیں۔ کسی نہ کسی مقام پر تو رستی کو ٹنگ ہونا تھا۔ تم اطمینان سے سو جاؤ، مجھے ابھی بہت جاگنا ہے۔“ پھر شاید پوری رات میں اور بہروز اپنی اپنی آہنی کوٹھریوں میں ساری رات جاگتے رہے۔ بہ ظاہر ہم دونوں ہی قیدی تھے، لیکن دونوں میں کتنا فرق تھا، ہم میں سے ایک ساری دنیا بیت کر اور جہاں بھری نعتیں سمیٹ کر اس مقبوض خانے میں پہنچا تھا اور شاید ہی اس کی کوئی حسرت باقی بچی ہو، جب کہ دوسرا وہ بد نصیب تھا، جس کی زندگی ہی غم بھر حسرت کا دوسرا نام رہی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ تقدیر اس دنیا میں ایک ہی وقت میں کسی عرب شہنشاہ یا امریکی ارب پتی کے گھر پیدا ہونے والے اور میری کچی پستی میں جنم لینے والے دونوں میں کیسے توازن رکھتی ہوگی۔ بادشاہ اور فقیر کے گناہ و ثواب برابر کیسے تولے جا سکتے ہیں، چاہے وہ دونوں ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ آخر اس فرق کی کوئی توجہ ابھوگی۔ کوئی تو صلہ یا انعام ملے کر رکھا ہو گا اور پوالے نے۔ کسی مقام پر تو اس فقیر کی محرومیوں کا حساب برابر کیا جائے گا یا پھر اسے بھی تقدیر کا ٹکٹا سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا۔

اگلے روز عدالت میں قاضی کے سامنے وکلاء کی بحث شروع ہونے سے پہلے ہی کریم نے اپنا گناہ قبول کر لیا اور ساتھ ہی عدالت سے درخواست کی کہ گرفتار شدہ عملے میں بہت سے ایسے بھی ہیں، جن کا اس کی بھرمانہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں، لہذا انہیں ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ ہم سب مضم کمرے بہروز کریم کا بیان سنتے رہے۔ اس نے اپنے بیان میں اپنے ہر جرم کا مرکز کی کردار خود ہی کو ضمیر لایا۔ فیروز اپنے مالک کی باتیں سن کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہم سب کی جھلکیں غم تھیں۔ بہروز کریم کا بیان کسی زندہ انسان کا اقرار نامہ نہیں لگتا تھا۔ کہتے ہیں، زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہم بہت دیر بعد اسے جینا شروع کرتے ہیں، لیکن بہروز کے بیان کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس نے زندگی کو بھر کے جی لیا ہے، اتنا کہ اب وہ اس قماشے سے اوب چکا ہے۔ کچھ لوگ صدیوں زندہ رہ کر بھی ایک میل زندگی جی نہیں پاتے اور کچھ میل بھر میں صدیوں کا مزہ کشید کر لیتے ہیں، تو پھر ہم کسی بھی شخص کی عمر کو سال اور مہینوں میں کیوں ناچتے ہیں، یہ کیوں نہیں کہتے کہ فلاں شخص دو میل جیا اور پھر مر گیا اور فلاں عمر بھر جیتا رہا۔ ایک مہینے کے اندر قاضی نے بہروز کو موت کی سزا سنائی۔ فیروز خان کو بھی اس کی معاونت کے جرم میں زندگی کی قضاء کی سزا ملی۔ چند عرصہ قید ہوئی اور مجھ سمیت کچھ دوسرے نامکمل شہادتوں کی بنیاد پر رہا کر دیے گئے۔ انصاف وہی ہوتا ہے، جو فوری ہو، ہمارے ہاں تو انصاف اتنی دیر سے ملتا ہے کہ خود انصاف سزا بن جاتا ہے۔ بہروز کریم نے اپنی ساری دولت، چاند اور اٹاٹوں کو وہ حصوں میں تقسیم کر کے ادھاحضہ اپنی بیوی اور بچوں میں بانٹ دیا اور ادھاپنے تمام بچ جانے والے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے وہ تمام ٹرسٹ اور فلائی ادارے بھی ہمیشہ کے لیے یک جا کر کے ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے زیر اہتمام کر دیے، جو اس کی سرپرستی میں چلتے تھے اور جن کی کمائی سے ہزاروں ضرورت مندوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ظالم بہت جی ہوتا ہے۔ بہروز کریم اگر ظالم تھا تو سخاوت کا یہ معیار اس کے شایان شان تھا۔ شاید چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا گناہ کا بھی کہیں نہ کہیں اپنے اعمال کا وزن برابر رکھنے کی

شدید خفا میں جتنا رہتا ہے۔ ہم کچھ بھی کر لیں، مگر سزاوار جزا کا یہ نظام خود بخود ہی ہماری رگوں میں سرایت کیے رہتا ہے۔ میں بہروز کریم کے اناٹوں کی وصیت پڑھتے ہوئے رو پڑا۔ اس نے اپنے محل میں پڑا ہوا بڑا پیاؤ میرے نام لکھ دیا تھا، اور پھر ساتھ ہی ایک ضمنی نوٹ میں تحریر تھا کہ چون کہ اس پیاؤ کا وزن بہت زیادہ ہے اور بہروز کو خدشہ ہے کہ اس کی محبوب بیوی کا یہ پسندیدہ پیاؤ محل سے کہیں منتقل کیے جانے کی صورت میں اپنی اصل شکل و صورت کھو دے، لہذا وہ جاندا، جہاں وہ پیاؤ پڑا ہوا ہے، تمام منزل اور انگیسی سمیت پڑی زاد کے نام کی جاتی ہے۔ بہروز جاتے جاتے ہم سب کے نام اتنا کچھ کر گیا تھا، جو ہم سب کی سات لکھوں کے لیے کافی تھا۔ اس نے اپنے تمام اداروں میں کام کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ افسر سے لے کر ایک معمولی نوکر اور چڑا سی تک کو براہ رفاً تھا۔

آخری ملاقات کی رات، جب ہم سب کارکن اس سے آخری باطل کرواپس لوٹ رہے تھے، تو میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا رہا۔ سب جا چکے، تو بہروز نے میری طرف دیکھا۔ ”تم مجھ سے نہیں ملو گے پڑی زاد۔“ مجھ سے رہائش گیا اور میں تمام ادب و آداب بالائے طاق رکھ کر دوتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا اور پھر مجھے سنبھالتے ہوئے بہروز بھی رو پڑا۔ اس آہنی اور فولادی وجود و اعصاب کے آدمی کو میں نے پہلی بار نرم آنکھیں لیے سر جھکا کر کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ”کیوں کیا آپ نے ایسا.....؟“ کیوں خود کو موت کے منہ میں جھونک دیا، آپ کے دکھ اور قانونی مشیر اتنے اہل تو تھے کہ آپ کی سزا کو کم از کم عمر قید میں تبدیل کر دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سزا آپ نے اپنے لیے خود کو جو بڑی ہے، قاضی نے تو بس اپنے دست خط ثبت کیے ہیں، آپ کے فیصلے پر۔“ بہروز نے سر اٹھایا ”شاید میں پہلی کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا پڑی زاد۔ لیکن یہ محبت بڑے بڑے تباہ و رشتوں کو دیکھ کر طرح کھا کر ڈھا سکتی ہے۔ یہ احساس مجھے بہت دیر میں ہوا۔ میں نے اپنے لیے یہ سزا اس لیے جو بڑ نہیں کی کہ میں نے اُسے مار کیوں ڈالا بلکہ میں نے خود کو یہ سزا اس لیے دی ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ جب کہ میں اس کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اب میری وابستگی نہ تھی۔ مگر یہ راز تب کھلا، جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ جب میں نے جانا کہ میں بھی اب اس کے جانی نہیں پاؤں گا۔ اگر مزید زندہ رہتا تو یہ منافقت ہوتی۔ اور بہروز نے آج تک ہر گناہ کیا ہے، سوائے منافقت کے۔“ اس نے مجھے آخری مرتبہ سمجھنے کے گلے لگایا ”اپنا خیال رکھنا، بہت قیمتی ہو تم، مگر نہ جانے کیوں، خود کو اتنا زراں کر رکھا ہے۔“ میں ایک بار پھر رو پڑا۔ بہروز سے رخصت ہونا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا، مگر سپاہی میرے سر پر آکھڑا ہوا۔ واپسی پر میں فیروز خان کی کوٹھری کے پاس ڈک گیا، وہ آہٹ سن کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ میں

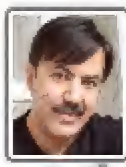
نے غم پلکوں سے اس کا استقبال کیا ”جار ہے، جو فیروز؟“ وہ ڈکھ سے مسکرایا ”ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مالک کے ساتھ ہی چلا جاؤں، تو بہتر ہے، میں نے ان کی زندگی کی حفاظت کی قسم کھا رکھی تھی، دعا کرو کہ کل مجھے اُن سے پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، ورنہ میں اور چار خد کا کوکوا منہ دکھاؤں گا.....؟“ میں نے فیروز کا کاٹدھا تھپتھپایا ”تم سے بڑھ کر وفاداری اس دنیا میں بھلا کسی اور نے کیا سمجھائی ہوگی۔ بے وفا تو ہم ہیں، جنہیں تم یہاں تنہا کسی آسے کے بغیر چھوڑے جا رہے ہو۔ کہاں ملے گا اب مجھے تم جیسا سچا اور وفادار دوست؟“ فیروز مسکرایا ”پاکستان میں میرا ایک بھائی ہے کبیر خان، ضرورت پڑے تو اسے اپنے پاس بلا لینا، ہم دونوں کا ایک ہی خون ہے۔ اب تم جاؤ پڑی زاد، مجھے اپنی آخری عبادت کرنی ہے۔ شاید یہ آخری جدہ ہی وہاں کام آ جائے، ورنہ عمر تو بس ریاگیاں گئی۔“ میں آنکھوں میں آنسو لیے بو جھل قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

بہروز اور اس کے وفادار فیروزی کی آخری رسومات ایک ساتھ ادا کر کے انہیں اسی شہر میں دفن دیا گیا، جہاں انہوں نے عروج کی آخری منزل سر کی تھی اور جہاں وہ ایک ساتھ نر وال پڑے ہوئے، بہت دنوں تک تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ غم کی شدت شاید ہماری قوت گویائی بھی سلب کر لیتی ہے۔ میں گھٹنوں بڑے ہال میں گم گم بیٹھا اس بڑے پیاؤ کو دیکھتا رہتا، جسے کبھی لیلیٰ صابینہ کڑھ بھجائی کرتی تھی۔ شاید اس کی نازک انگلیوں کے نشانات بھی ابھی تک اس پیاؤ کے سرور پر ثبت ہوں گے۔ میرا جی ہی نہیں مانتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ لگا کر اس کے نشان منادوں۔ پھر ایک شام بار تھا واپس آئی اور مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے رُہ سے کے لیے انگینڈ لگتی ہوئی تھی، جب یہ ساری واردات ہوئی۔ میں نے مارتھا کو پھر سے کام پر رکھا اور اس سے انگیسی میں شفٹ ہو جانے کی درخواست بھی کی۔ جانے کیوں وہ مجھے اس محل اور لیلیٰ صابینہ کا ایک حصہ نظر آتی تھی۔ رفیق کو بھی میں نے دوبارہ دعویٰ واپس بلوایا تھا۔ مگر اس نے محل میں منتقل ہونے سے معذرت کرنی ”نہیں پیارے! یہاں پر ڈی جتنا ہے، مالک یہ سب کچھ حیرے نام کر گئے ہیں، مجھے اسی فلیٹ میں رہنے دے۔“ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب یہی ہوگا۔ ”نہیک ہے، مگر ایک شرط تمہیں میری بھی مانی ہوگی، ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے دل سے اپنا دوست نہیں مانا۔“ ”کبھی شرط.....؟“ میں نے دراز سے ایک چابی نکال کر اس کے ہاتھ میں بٹھائی۔ ”تم ہمیشہ سے یہاں ایک بہت اچھا پاکستانی ریسٹورنٹ کھولنا چاہتے تھے ناں، یہ تمہارے ریسٹورنٹ کی چابی ہے۔“ رفیق کچھ دیر تک ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہوا اور پھر اس نے مجھے آگے بڑھ کر گلے لگایا ”تُو صرف نام ہی کا نہیں، دل کا بھی پڑی زاد ہے.....“ بہروز کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ امیر کیسے امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں، دولت ایک ایسا مٹھاٹیس ہے، جو صرف دولت کے لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ بہروز کے شروع کیے گئے درجنوں منصوبے جو میرے حصے آئے تھے وہ وہیسا کھینچنے کے کچھ ایسے ہی مٹھاٹیس تھے، میرا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ میں اپنے فیروز کی بنائی ہوئی اسٹیکر میں پیسے لگاؤں اور پھر منتوں بیٹھ کر ان سے حاصل ہونے والا منافع گنتا رہوں۔ اس سے کہیں زیادہ محنت تو میں استقامت منانے کے ورکشاپ پر دن کے چند گھنٹوں میں کر لیتا تھا۔ یا پھر شاید ان امور کو بیٹھ کر یوں دولت گنتا بھی محنت ہی لگتی ہو، لیکن میں اس مع تقریق کے کھیل سے چند بیٹوں ہی میں آکتا نہ لگا۔ دولت مند کو دولت خرچ کرنے کا سلیقہ نا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہی دولت اس کے لیے سرور دے لگتی ہے۔ میرے فیروز مجھے روزانہ پیسا کمانے کے نئے گرتاے اور پھر جب ان کے منصوبے کام یاب ہو جاتے تو وہ پارٹی کرتے، جشن مناتے۔ انہیں اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ میں ان کی دماغی عرق ریزی کے نتیجے اب بہت آکتا ہٹ سے سنبھالتا۔ ان ہی دنوں امین کی ایک بڑی تعمیراتی کمپنی نے ہمارا ٹینڈر منظور کر لیا۔ میں سفر سے بہت کھرا تھا اور حتی الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ مجھے خود کہیں جانانہ پڑے، مگر اس بار کچھ ایسی صورت حال بنی کہ مجھے پاسلو ناجا نا ہی پڑا۔ یہ پیسا بڑے کمال کی چیز ہے۔ ایک ہی جیسے خوش پوش اور معزز دکھائی دینے والے انسانوں کو ہل بھر میں درجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری غلامت کا ٹکٹ عملے نے بزنس اگیز کیلئے کلاس میں سب سے اونچی تقسیم کا ٹکٹ کر دیا تھا، لہذا کچھ ہی دیر میں مجھ سے کہیں زیادہ خوش لباس اور اونچے درجے کے دکھائی دینے والے مسافر جہاز کے پچھلے حصے میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز کا سارا عملہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ مجھے جانے کیوں اپنے کالج کے روٹ پر چلنے والی لوکل بس یاد آئی، جس کے پائیدان پر لٹکتے ہوئے میں نے کالج تک ان گنت سفر کیے تھے، کیوں کہ میرے پاس اندر بیٹھنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے اور کنڈکٹر ترس کھا کر چند سٹوں کے عوض مجھے پائیدان پر لٹکتے ہی کی اجازت دیتا تھا۔

انہیں کے جس سات ستارہ ہوئی میں میرا قیام تھا۔ اس کے صدر آتی سوئٹ سے باہر دیکھنے پر دروازہ کھولا اور لکڑی سے بنایا ایک بہت بڑا سا گول اکھاڑہ دکھائی دیتا تھا۔ میرے میزبانوں نے اگلی شام معاہدہ طے ہو جانے کی خوشی میں مجھے اُسی اکھاڑے میں بھینے کی انسان سے جنگ دکھانے کا اہتمام کر دیا۔ میں نہیں جانتا چاہتا تھا، مگر میزبان بے ہمت تھے کہ کوئی انہیں آئے اور یہ تماشا نہ دیکھے، تو اسے کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو دنیا کے کبھی بڑے شہر اب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ وہی بھاگ دوڑ، نفسا نفسی، سب کا ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ خوش اور مطمئن جان کر خود کو مزید مشقت میں مبتلا کرنا، مگر یہ شہر اپنی بڑے شہروں سے کچھ جدا دکھائی دے رہا تھا۔ مشرقی اور مغربی تعمیر کا سنگم، مجھے بچپن میں آندہ لائبریری سے کرائے پر لی گئی الف لیلٰی کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ وہی محرابیں، وہی ستونوں کی قوس قزح، اندرون شہر اینٹوں کی کئی گلیاں اور سے بنی تعمیر کا شاہ کار، الف لیلوی گھر اور عمارتیں..... مسلمان کیا تھے، اور کیا سے کیا ہو گئے۔ دنیا کی تاریخ میں جتنا عروج اور پھر جتنا زوال ہم مسلمانوں نے دیکھا ہے، شاید ہی کسی اور قوم اور مذہب نے دیکھا ہو، شام چار بجے ہم اکھاڑے میں اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اکھاڑہ کچھا کچھا تماشا بیٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان سدا کا وحشی ہے اور سے یہ وحشت بھرے قماشے دیکھنے میں ہمیشہ ہی لطف آتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں سیاہ مائل فاننگ کے سوٹ پر سرخ جینٹ اور سر پر کالا ہیٹ پہنے ایک سرخ چادر لہراتا، ہسپانوی ٹلی فائٹر اکھاڑے میں داخل ہوا تو تماشا بیٹوں نے تالیوں اور بیٹیوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کنواری لڑکیوں نے اس ویدھ لڑکے پر پھولوں کی بارش کر دی۔ مگر ٹلی فائٹر نے صرف ایک گلاب اٹھا کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا، جو اس کی محبوبہ نے اس پر پھینکا تھا۔ میرا خاص میزبان مجھے یہ ساری رو دوا کسی رواں تبصرے کی طرح سنار ہاتھا۔ یہ لڑکا انہیں کے بہترین ٹلی فائٹر میں سے ایک تھا، جسے لوگ انٹونو کے نام سے جانتے تھے۔ انٹونو آج تک انہیں کے ننانوے جنگی بیٹھنوں کو اپنے اکھاڑوں میں ہرا کر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور آج اس کا یہ ایک سوواں مقابلہ تھا۔ اور اس نے اپنی محبوبہ ماریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا سیکڑا مکمل کر کے ماریا سے شادی کر لے گا۔ سارا شہر یہ بات جانتا تھا اور اسی لیے آج اکھاڑے میں بیل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دوسری جانب اندھیرے قید خانے میں کھڑا بیٹھنا بھی آج اپنی سوویں لڑائی لڑنے جا رہا تھا۔ لوگوں نے اس کی وحشیانہ طاقت کی وجہ سے اس کا نام ”بکر“ رکھ چھوڑا تھا، اور بکر نے اپنے نناوے گزشتہ مقابلوں میں کسی بھی ٹلی فائٹر کا جسم ادھیڑے بنا اسے اکھاڑے سے واپس نہیں جانے دیا تھا۔ مگر اپنے وقت کے یہ دو بہترین لڑاکا آج پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے مد مقابل آ رہے تھے۔ انٹونو نے اپنی تلوار کی چمکتی دھار کو ہٹھو کر دیکھا، اور کمرے میں بند بکر نے اپنے گھر سے ریشمی زین کو کھڑ دھجا، ماریا نے انٹونو سے وعدہ دیا تھا کہ اس آخری بیٹھنے کو ذریعہ کرنے کے بعد وہ اس کیل کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہے گا، کیوں کہ ماریا اپنے محبوب کے توانا جسم پر مزید نو کیلے بیٹگوں کی کاٹ اور زخموں کے نشان نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ انٹونو نے اپنی سیاہ مٹلی پوشاک کے شہری مٹن بند کیے اور گھٹنوں تک لیے مخصوص چڑے کے جوتوں کے تسمے باندھے اور تلوار کی نوک زمین پر ٹیک کر ایک شاہ بے نیازی سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لڑائی کے لیے تیار ہے۔ تماشا بیٹوں کی تالیوں، بیٹیوں اور شور سے کان پر پی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ماریا نے اپنے سر پر نئے سیاہ جالی کے نقاب والے ہیٹ کو ذرا سا سر کا کر انٹونو کو سلام کیا اور ہاتھ میں کھڑا دوسرا سرخ گلاب بھی اس پر نچھاور کر دیا۔ ٹھیک اسی لمحے میری نظر اکھاڑے میں دوسری جانب بیٹھے ایک شخص پر پڑی، جو میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تعظیم سے سر نہکا کر سلام کیا۔ شاید میں نے اسے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا، مگر اس وقت میری پوری توجہ انٹونو اور بکر کے مقابلے پر تھی۔ بکر کی آنکھوں سے دہنی بنا کر اس کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اور اب وہ اکھاڑے میں داخل ہونے کے بعد اپنے سوویں شکار انٹونو کو اکھاڑے کے درمیان کھڑا سرخ کپڑا لہراتے دیکھ رہا تھا۔ بکر اتنی جنگوں کے بعد ایک بات تو اچھی طرح جان چکا تھا کہ اس کا اصل ہدف وہ بے جان سرخ کپڑا نہیں بلکہ اس کے عقب میں کھڑا وہ سفاک دشمن ہے، جو پہلے اسے تماشے کی غرض سے خوب تھکائے گا اور پھر بڑھ چال کرنے کے بعد ٹھیک اس کی دوا آنکھوں کے درمیان نازک جلد والے حصے میں اپنی تیز دھار تلوار پوری طرح گھونپ کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا، مگر اسے یہ لمحہ آنے سے پہلے ہی اپنے دشمن کو اپنے نو کیلے بیٹگوں میں پر دکر آسمان کی جانب اچھال کر اس کے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دینا ہو گا۔ ٹلی فاننگ دراصل بیٹھنے اور لڑاکے (ٹلی فائٹر) کے درمیان اعصاب کی جنگ ہوتی ہے اور جو اپنے اعصاب قابو میں رکھے، وہی فاتح بن کر اکھاڑے سے باہر نکلتا ہے۔

انٹونو نے سرخ مٹلی کپڑا لہرایا، جنگ شروع ہو گئی۔ بکر کا پہلا وار خانہ لیا گیا اور انٹونو نے اپنی تلوار سے اس کے جسم پر ایک چرکا لگا کر بکر کے مضبوط جسم پر پڑے درجنوں دھاغوں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا۔ بکر غضب ناک ہو کر پلٹا اور زور سے بھاگتے ہوئے قریب آ کر اچانک اپنا زور یہ بدل لیا۔ اس کے تیز دھار سینک کی نوک نے انٹونو کے پہلو میں چنگاریاں ہی بکھریں۔ تماشا بیٹوں کی چیخیں نکل گئیں اور مارا بگھرا کر کھڑی ہو گئی۔ انٹونو اور بکر دونوں ہی جان چکے تھے کہ ان کا مقابلہ آج کسی عام ریف سے نہیں۔ انٹونو کے ہاتھ میں کپڑی سرخ چادر اب دھیرے دھیرے مجھوتروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی اور جہاں بکر کا جسم انٹونو کی تلوار کے چوکوں سے لہو بہا ہوا تھا، وہی انٹونو کا بدن بھی بے حد مہارت اور احتیاط کے باوجود خراشوں سے بھر چکا تھا اور دونوں ہی شدید تھکن سے نڈھال تھے۔ ماریا جب اپنے محبوب کو اس خوں خوار قاتل بیٹھنے کے جسم سے سُس ہوتے دیکھتی تو اس کے حلق سے بے اختیار گھٹج بلند ہو جاتی۔ اس نے جہاں کر انٹونو سے کہا ”انٹونو! بس کرو، میرے فائٹر، یہ دیوانگی ہے۔ مقابلہ ختم کر دو۔“ مگر انٹونو نے مسکرا کر اپنی زندگی کو دیکھا اور آخری بار چادر لہرا کر پھینک دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بیٹھنے کی آنکھوں کے درمیان تلوار گھونپنے کے لیے تیار ہے، مگر اس نے خود کو بھی بکر کے سامنے پوری طرح عیاں کر دیا تاکہ بیٹھنا ساری احتیاط بھلا کر تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور انٹونو موقع ملے ہی اسے ختم کر دے، تماشا بیٹوں کا شور اور چیخیں آسمان تک بلند ہو رہی تھیں اور وہ سب انٹونو کو اس دیوانگی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انٹونو اپنی زندگی کا آخری مقابلہ ہار کر واپس پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ بکر نے پلٹ کر اپنے اس بہادر دشمن کو دیکھا اور چند لمحے رک کر دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قتلے رہے اور پھر کھڑا آتا اور سے جھاگ بھاگتا انٹونو کی طرف دوڑتے ہوئے لپکا۔ انٹونو نے اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں اکڑا کر تلوار کا دست مضبوطی سے اپنے ہوا میں اٹھنے دائیں ہاتھ میں تمام لیا۔ بکر بھی سمجھ گیا کہ اس کا یہ آخری حملہ ان میں سے کسی ایک کے لیے تخت یا تختہ ثابت ہونے والا ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین جانور تھا اور دشمن کی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے اپنے جسم کو اچانک ایک جھکا کر دی، تاکہ اپنے سر کی جانب ہلکتی تلوار کی نوک سے بچ سکے، مگر تلوار سے تک اس کے سر میں اثر پہنچی تھی۔ خود انٹونو بھی بکر کے ٹٹوں و ذنی جسم کی زوردار ٹکر سے کئی فٹ ہوا میں اچھلا اور جب وہ زمین کی طرف گر رہا تھا تو بکر کے نو کیلے سینک اس کے گرتے جسم کا انتظار کر رہے تھے۔ انٹونو کے جسم میں بکر نے اپنے سینک پر دو دیے۔ اور ایک لمحے بعد ہی دونوں اکھاڑے کی دیشی زمین پر گرے اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے، دونوں نے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنے بہادر دشمن کو آخری پیغام دیا ”بہت خوب..... تم واقعی بہترین لڑاکا تھے میرے دشمن.....“ ماریا اپنے محبوب کی حالت دیکھ کر صدمے سے لہرائی اور وہیں گر کر بے سندھ ہو گئی۔ سارے مجھے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ عورتیں رو پڑیں، اپنی اپنی زندگی کے آخری مقابلے میں کھرا اور انٹونو دونوں ہی برابر رہے تھے۔ تماشا ختم ہو چکا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے کسی نے میرے کانہ سے ہاتھ رکھا۔ نہیں اس سارے قماشے میں انٹونو تھا کہ مری طرح چوک گیا، یہ وہی شخص تھا، جس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے مجھے سلام کیا تھا۔ وہ سراسر انداز میں مسکرایا ”بہت تلاش کیا ہے تمہیں۔ آخر کار، آج پکڑے ہی گئے.....!!!“

(جاری ہے)



پاشم ندیم

پاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، نملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہنا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب اس ظاہر پسند و زبردست دنیا کے آن گشت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتہ وی پرانا ہے:

ایڈیٹر، سنڈے میگزین، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا، وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ ”کیا ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“ وہ مسکرایا ”ہم دونوں نہیں، صرف میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ تم پر ی زاد ہوتا، بہروز کریم کے جاں نظیم۔۔۔۔۔“ ”نہیں، میں صرف پر ی زاد ہوں۔ بہروز کا جاں نظیم بننے کی اہلیت نہیں ہے مجھ میں۔“ اس نے ہاتھ اٹھ کر بڑھایا۔ ”لوگ مجھے سینٹھ ابراہیم کے نام سے جانتے ہیں، بھارت کی شان، بمبئی میں رہتا ہوں۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بمبئی، ہاں بھی، بمبئی، یہ نیا نام بمبئی میں تو بالکل نہیں چٹا، جو بات بمبئی میں تھی، وہ اس بمبئی میں کہاں۔ جانے یہ لوگ شہروں کے نام کیوں بدل دیتے ہیں، کتنی یادیں بھولی ہوئی ہیں ان ناموں کے ساتھ، اب تمہارے لاہور کو کوئی کل سے اچانک ٹمکنو کہہ کر بلانا شروع کر دے، تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ میں اس کی بے تکلفی سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ”تم نے مجھے بتایا نہیں، تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“ ”سینٹھ ابراہیم میرے ساتھ چلتے چلتے اکھاڑے سے باہر آ چکا تھا۔ میرے میزبان نے مجھے باہر آتے دیکھ کر گاڑی منگوائی۔ میں نے ابھی گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ سینٹھ ابراہیم کی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے آ کر لگ گئی۔ سینٹھ ابراہیم نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔“ میں شام کو تم سے ملنا چاہتا ہوں، تمہارا مالک بہروز مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم بزنس پارٹنر تھے، باقی باتیں شام کو ہوں گی۔“ ”سینٹھ ابراہیم مجھے ایک نئی انجمن میں جتلا کر کے چلا گیا، شام کو سو ٹمنگ پول کے کنارے مجھی کرسیوں پر وہ مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے براہ راست مذہبی بات کی۔“ ”ہاں بولو سینٹھ ابراہیم تمہیں مجھ سے ایسا کیا خاص کام ہے؟“ ”سینٹھ دھیرے سے مسکرایا ”تم نے شاید خود سے میرا نام نہیں سنا۔ مجھے ابراہیم کہتے ہیں۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میرے دم سے چلتی ہے، میں زیادہ تر دہائی میں رہتا ہوں۔ یہاں اسپین میں بھی ایک فلم کی افتتاحی تقریب میں آیا تھا۔ خوش قسمتی سے تم بھی اسپین مل گئے۔ شاید بہروز نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس کارڈ کا کالا دھن ہماری فلم انڈسٹری میں سفید ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا وہ پرانا رشتہ برقرار رہے۔ کہو، کیا کہتے ہو۔۔۔۔۔؟“ ”میں کچھ سمجھا نہیں۔۔۔۔۔؟“ ”ابراہیم نے اپنی آنکھوں پر لگا قیمتی دھوپ کا چشمہ اتارا۔“ ”ہم بھارتی فلموں میں اپنا روپا لگاتے ہیں، ایک فلم ستر، اتنی کروڑ لک چلی جاتی ہے۔ فلم چل جائے تو تین چار سو کروڑ لے آتی ہے، ہٹ بھی جائے تو ہمارا کچھ نقصان نہیں، ہمارے ٹکس کے وکیل اس نقصان کو تین گنا بڑھا کر ٹکس کے گوشواروں میں بھر دیتے ہیں۔ مطلب چھت بھی ہماری اور پٹ بھی۔ منافع ہوتا تو ساری دنیا کے سامنے سفید دھن آتا ہے، نقصان ہوتا تو ہمارا کالا دھن نقصان کے پردے میں ٹھپ جاتا ہے۔ بولو، پیسا لگاؤ فلم انڈسٹری میں؟“ ”تمہاری پیش کش کا شکریہ، مگر میرا کالا دھن کمانے یا اسے سفید کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے پاس جو ہے، وہ بھی میری اوقات سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہیں سنہٹا۔“ ”سینٹھ ابراہیم طرے مسکرایا۔“ ”جانتا ہوں، تم شاید پہلے بہروز کے خاص محافظ تھے، مگر یاد رکھو، اپنی سلطنت قائم رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے اور شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ بمبئی کی فلم انڈسٹری پر ہمیشہ سے انڈر ورلڈ کا راج رہا ہے۔ ہم ان کھیلوں کو اپنی انگلیوں پر نہاتے ہیں۔ آدھی رات کو بھی ہمارا فون چلا جائے تو ان کے بڑے بڑے ستارے بھاگے چلے آتے ہیں، ورنہ کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ شاہ رخ، سلمان، کرینہ یا کترینہ کسی کے بیٹے، بھائی کی سال گرہ میں ایک کنوارے چلے آئیں۔ یا ہمارے خاندانوں کی کسی شادی میں اسٹیم بصر پیش کرنے کو روڑے آئیں۔ یہ سب

ہماری زیر زمین دنیا کی طاقت کے کرشمے ہیں اور سچ پوچھو تو ان لوگوں پر حکومت کر کے بڑا مزہ آتا ہے۔ اور چوں کہ بہروز کریم ہماری اس سلطنت کا ایک اہم عہدے دار تھا۔ لہذا میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں بھی شمولیت کی دعوت دوں۔ آگے فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ ویسے تم اتنا لے دے کیوں رہتے ہو۔ دہائی میں بھی، ہمیں نے تمہیں کبھی کسی تقریب میں نہیں دیکھا۔ سنا ہے، پیتے پلاتے بھی نہیں، کیوں یہ جوگ لے رکھا ہے تم۔۔۔۔۔؟“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”شاید یہی جوگ میرا مقدر ہے، اور میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے کسی سلطنت یا رتبے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں شاید ازلی طور پر غلام ہی پیدا ہوا ہوں، غلام ابن غلام۔۔۔۔۔ اپنی غلام۔ اور اب مجھ میں کوئی ”خوئے سلطانی“ پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ یہ تم جیسوں ہی کے سر پر جتنی ہے۔“ ”سینٹھ ابراہیم میری بات سن کر سنجیدہ سا ہو گیا۔“ ”تم نے کڑوے سچ اتنی آسانی سے کیسے بول لیے ہو۔۔۔۔۔؟ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے بہروز والے نعل میں کسی

عورت کا بھی آنا جانا نہیں ہے۔ شراب، عورت اور جوا اگر یہ سب تمہاری زندگی میں کوئی مسمیٰ نہیں رکھتے، تو پھر اتنا پیسا بھی کس کام کا۔ آخر کوئی تو خواہش ہوگی تمہاری۔۔۔؟“ میں چپ رہا، اب میں اسے کیا بتانا کہ میری خواہش ساری دنیا سے جدا ہے۔ ہر آرزو سے سوا ہے۔ مجھے تو بس ایک نگاہ چاہیے۔ اپنے نصیب کی ایک جھلک، صرف ایک پیار بھری نظر، جو صرف میرے لیے ہو۔ پتا کسی فقیر، مظلوم، حقارت اور ترحم کے جذبات کے۔ سیٹھا ابراہیم جاتے جاتے چند لمحوں کے لیے رکھا۔ ”اچھے لگے، موت مجھے لانا نہیں ہے تمہارے اندر اور جو شخص اپنی خواہشوں پر قابو پا لے، وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا ہے۔ کبھی کسی مقام پر میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا، ہاں، تمہیں ایک ضروری اطلاع بھی دینی تھی مجھے۔ دینی پولیس تم پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، نہ صرف تم پر بلکہ بہروز کے ہر قریبی ساتھی پر، ان کی خاص توجہ ہے آج کل۔۔۔۔۔ تم اسی لیے بچے ہوئے ہو، کیوں کہ انی انہیں تمہارے خلاف کسی غیر قانونی سرگرمی کی خبر نہیں ملی، مگر تمہیں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ بہت عرصے تک بہروز کو بھولنے والے نہیں ہیں۔“ سیٹھا ابراہیم واپس پلٹ گیا۔

میں دینی واپس پہنچا تو پہلی مرتبہ اپنی اطراف غور سے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے سیٹھا ابراہیم کی بات ٹھیک لگی۔ دینی انرپورٹ ہی سے میری مگرانی شروع ہو چکی تھی، ایک سرکاری گاڑی نے گھر تک ہمارا پیچھا کیا اور پھر صبح وشام، آتے جاتے میں نے کچھ مخصوص چہروں اور گاڑیوں کو ہمیشہ اپنے گھر، دفتر اور ہر اس جگہ کے آس پاس پایا، جہاں مجھے پہنچنا ہوتا تھا۔ مجھے ایک عجیب سی گھنٹی چوبیس گھنٹے محسوس ہونے لگی، جیسے وہ شہر نہیں، کوئی قید خانہ ہو، شاید سلاخوں کے پیچھے قید رہتا گھلے آسمان تلے قید رہنے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی اب میرا جی اس ریت اور ہیمنٹ سے بنی عمارتوں کے صحرا سے آگے نہ لگا تھا، لہذا میں نے اپنے ٹمک واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ رفتی نے یہ خبر سنی تو آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا۔ ”خوش کر دیا تو نے یار۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیوں، مگر مجھے ہر وقت تیری طرف سے دھڑکاہٹ لگتا رہتا ہے۔ ٹو پھل، میں بھی تیرے پیچھے سب سمیٹ کر واپس پلٹتا ہوں۔ ہماری مٹی اور ہمارا ضمیر یہاں کا نہیں ہے یار۔۔۔۔۔ چاہے ساری عمر گزرا لیں، پھر بھی ایک اجنبیت اور غیریت کا احساس ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ چاہے وہاں اپنے ملک میں کچھ بھی ٹھیک نہیں، پر اس ان جانے پن سے تو نجات ملے گی۔“ میں نے اپنے باقی ایشاف کو جمع کر کے اپنی واپسی کا فیصلہ سنایا تو وہ پریشان ہو گئے کہ پیچھے اتنا بڑا کاروبار کون سنبا لے گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں مینے میں ایک دو بار چکر لگایا کروں گا اور پھر آج کل تو ہزار سہو تئیں پیدا کر دی ہیں، ان من مانی ایجادات نے۔ انسان جسمانی طور پر چاہے موجود نہ ہو، پر تصور اور آواز کے ذریعے چوبیس گھنٹے رات دن باطلے میں رہ سکتا ہے۔ محل کے معاملات میں نے ہمارا کویئر ٹیکر بنا کر اس کے حوالے کر دیے اور اس سے، دینی سے صرف بہروز کا سفید پٹا تو پاکستان بھجوانے کی درخواست کی۔

میرے عملے نے دو ہفتے کی جاں فشانی کے بعد میرے ہی شہر کے سب سے پوش علاقے میں میرے لیے ایک بنگلہ خرید کر اسے اپنے طور پر آراستہ بھی کر دیا تو اتنا اور پھر میری روانگی کا دن بھی آ گیا۔ میں نے رفتی کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ میری واپسی کی خبر کو سختی الامکان زیادہ پھیلنے سے روکے رکھے، مگر میں اسے یہ تاکید کرنا بھول گیا کہ یہی احتیاط وہ پاکستان میں میرے خاندان والوں کے لیے بھی روادار رکھے، اور پھر وہی ہوا، جس کا ذکر تھا، میرے شہر کے ہوائی اڈے کے باہر انتظار گاہ میں میرا سارا خاندان گل دستے اور ہار لیے میرا انتظار کر رہا تھا، سبھی بہن بھائی اور ان کی اولاد، بھانجیاں اور بھائیوں کی بہنیں اور ان کے خاندان کے بزرگ، پورا ایک لشکر میرے استقبال کے لیے موجود کھڑا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا، جب میں یہاں سے دینی جانے کے لیے ایک پرانے رستے میں انرپورٹ پہنچا تھا۔ اُس دن میرے گھر کے گھنٹک بھی کوئی مجھے رخصت کرنے نہیں آیا تھا۔ وقت بھی کسی کروٹیں بدل لیتا ہے۔ نہ جانے کیسے ہل میں بدل جاتے ہیں، یہ دنیا کے بدلنے رشتے۔۔۔۔۔ ساری عمر جنہوں نے ہر ی زاد پر سنگباری کی، آج وہی لوگ پھولوں کی پٹیاں بچھا کر رہے تھے، جوتج یہ ہے کہ مجھے ان کے برساتے پتھروں نے اتنی جوت نہیں پہنچانی تھی، جتنا لولہاں مجھے ان کے چھینکے ہوئے پھولوں نے کیا۔ بھائیوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں، میں تقریباً سات سال بعد واپس لوٹا تھا اور ان سات سالوں میں، میں نے اپنے سب بہن بھائیوں کو اتنا روپا بچھا تھا کہ وہ سب آج اپنے ذاتی گھروں کے مالک تھے، بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ بھی اپنے گھروں میں خوش تھیں، سبھی کی خواہش تھی کہ میں کم از کم پہلا دن ان کے گھر پر گزروں، بھائیوں کی جو بہنیں اب رشتے کے قابل تھیں، وہ پوری تیاری کے ساتھ بن بن کر آئی تھیں اور ہر بھائی کی تقریباً یہی خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ میں وہیں انرپورٹ ہی پران میں سے کسی ایک کو پسند کر کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں، حالانکہ ان مظلوم لڑکیوں کے چہروں پر لکھی بے چارگی کی داستان صاف نظر آ رہی تھی کہ وہ خود پر کس قدر رجز کر کے خود کو اس امتحان کے لیے تیار کر پائی ہوں گی۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ مجھے ایک بے حد فوری نوعیت کی کاروباری میٹنگ کے لیے جانا ہے اور میں موقع ملنے ہی ان سب کی طرف فردا فردا حاضری دینے ضرور آؤں گا۔ میرا پاکستانی عملہ، جس کی بھرتی میرے منیجر نے چند ہفتے قبل ہی کی تھی، حیرت سے کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ انرپورٹ کی پارکنگ لین میں سیاہ مرشد بڑے گاڑیوں کا غلیٹ میرے استقبال کے لیے موجود تھا اور میں کسی نہ کسی طرح سب کو مطمئن کر کے، یا شاید غیر مطمئن چھوڑ کر اپنے گھر کو روانہ ہوا تو شہر کے راستے اور گلیاں مجھے اسی طرح خود پر مسکراتے نظر آئے، جیسے میں انہیں سات سال پہلے ملنا کا چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے ہم پر دیس جا کر یہ کیوں مجھے لگتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی دیس میں سب کچھ بدل چکا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی سڑکیں، وہی راہیں، جن پر میں جاتے کتنے سال تک جو تیاں چٹائی تار ہاتھا۔ میں شہر کے سب سے قیمتی علاقے میں اپنے نئے گھر پہنچا تو مجھے ان اجنبی دیواروں سے شناسائی میں کافی وقت لگا۔ بظاہر پتھر کے بے جان نظر آنے والے یہ درود دیوار بھی اپنے اندر ایک عجیب سا احساس رکھتے ہیں۔ ہم سے خوش یا ناخوش رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر ہم انسانوں کی محدود سماعت ان کی یہ گفتگو سن نہیں پاتی۔ شام کو میرے بلاوے پر کبیر بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ بہت حد تک اپنے بڑے بھائی فیروز سے مشابہت رکھتا تھا۔ مگر میں اس سے چھوٹا تھا۔ کبیر بھی فیروز کے ذکر پر افسردہ ہو گیا، میں نے اسے گھر کی تمام تر ذمہ داری سونپ دی۔ وہ شروع ہی میں اتنی بڑی ذمہ داری لینے سے کچھ ہنگامہ کرتا تھا، مگر میرے اصرار پر مان گیا۔ میں نے اسی کو اپنا سکریٹری اپنا چر بھی مقرر کر دیا اور شاید اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اسی کام میں راحت محسوس کرتا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنی جیب سے ایک خیر منور پتول کا لائسنس نکال کر مجھے دکھایا۔ ”یہ دیکھو صاب۔ ہمارے پاس اسٹیل کا لائسنس بھی ہے۔ ہمارے ہوتے آپ کو کسی گھر کا ضرورت

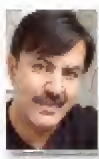
نہیں۔" میں جانتا تھا کہ کبیر خان سچ کہہ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے لوگوں میں شمار کے لیے آج کل ذاتی معاملوں کی ایک فوج بھی لازمی درکار ہوتی ہے۔ مجھے بہرہ ور کی ایک فصاحت ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ "جیسا ولس ہو، جیسے بھی ویسا ہی ضروری ہے۔۔۔۔۔۔ ورنہ یہ انسان عموماً دوسرے انسان کو کم تر سمجھنے میں دیر نہیں کرتا۔" اور میں نے پڑھیں میں اپنی زندگی کے اتنے سال کم تر دکھائی دینے کے لیے ضائع نہیں کیے تھے۔ جتنے بھری میں سارے شہر کے امراء کو خبر ہو چکی تھی کہ "پنی زینہ" نامی کوئی بہت بڑا صنعت کار شہر میں اپنا کاروبار پھیلانے کے لیے وارد ہو چکا ہے۔ ہاں، پنی زینہ۔ یہی نام تجویز کیا تھا میرے شیجرڈ نے میری نئی کمپنی کے لیے، اور جو مجھے میرے نام سے نہیں جانتے تھے، اب میں ان کے لیے پنی زینہ نامی ایک بڑا انڈسٹریل پیسٹ تھا۔ اس طرح مجھے اس تعارفی شرمندگی سے بھی عارضی طور پر نجات مل گئی تھی، جو پرانا نام بتانے میں مجھے ہمیشہ اٹھانی پڑتی تھی۔

یہ دولت مند لوگ اندر سے کھتے تھا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے چند دنوں ہی میں ہو گیا، جب چاروں طرف سے مجھے تعارفی دعوت ناموں نے گھیر لیا۔ یہ شام کی پارٹیاں، رات کی دعوتیں، کلہرے، بھڑانے اور عشائے۔ آخر ان امیروں کو اپنے ارد گرد ہر وقت اتنا جھوم کیوں چاہیے ہوتا ہے؟ یہ سب اندر سے شدید تنہا ہونے کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے، مگر میں تو ہمیشہ ہی سے ان پُر جھوم مفلوں سے کتر اتا تھا۔ لوگوں کی تیز چمکتی نظریں، طنز اور طعنوں کا عادی ہو جانے کے باوجود میں اس تجربے کو بار بار نہیں دہرانا چاہتا تھا۔ ہم اپنی زندگی میں بہت سی بے چینیوں اور دردوں سے بھی بھری پال لیتے ہیں کہ ہمیں حقائق سے نظریں چھپانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میرا اسٹاف شیجرڈ کمائی بہت تیز اور چلتا پڑھ جسم کا بندہ تھا۔ وہ شہر میں ہونے والی کسی بھی بڑی تقریب کا دعوت نامہ مجھ تک پہنچانے میں دیر نہیں کرتا تھا، مگر میں ہر بار کسی نہ کسی طور سے ٹال دیتا تھا۔

اگلے ہفتے سے میں نے سمندر کنارے ایک اعلیٰ ذاتی عمارت میں قائم اپنے دفتر جانا شروع کر دیا۔ ہمارا زیادہ تر کام ابھی تک دفنی آفس ہی سے ہوتا آ رہا تھا، مگر کمائی نے یہاں بھی خاصا عملہ بھرتی کر لیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر تعارفی سرطے کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ ایک بات میں کبھی بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ ان بڑے بڑے غیر متعلقہ دفاتروں میں اتنی بہت سی خواتین کیوں بھرتی کر لی جاتی ہیں۔ جب کہ کچھ کاموں کی نوعیت اس صہب نازک کی موجودگی سے بالکل بھی مسئل نہیں نکلتی۔ جیسا کہ ہماری تعمیراتی کمپنی، جانے کمائی نے اتنے بہت سے اسسٹنٹ اور ڈپٹی شیجرڈ ٹاپ نمبروں پر ان نازک لڑکیوں کو کیوں بھرتی کر لیا۔ میرے استشار پر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "ساری بات حسن لطافت کی ہے، سر، وہ جسے انگریزی میں Aesthetic Sense کہتے ہیں۔ ویسے بھی ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ جن دفاتر میں خواتین، مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں، وہاں کے مردوں کو زیادہ ذمے داری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ لباس اور اوقات کار کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں سرتی۔ اور دفتر کا ماحول بھی خوش گوار رہتا ہے۔" میرا جی چاہا کہ میں کمائی سے پوچھوں کہ اس نے دفاتر اور ان کے طریقہ کار پر ہونے والی میگزینوں کی تحقیقات میں سے صرف ایک اسی ریسرچ کو نافذ العمل کیوں سمجھا؟ مگر میں پُچ رہا۔ دفتر میں کام کرنے والی خواتین اور لڑکیاں بھی پہلی بار مجھے دیکھ کر اسی تذبذب کا شکار ہوئیں، جو میرے لیے ہر عورت کا خاصہ رہا تھا۔ مگر میں اس کمپنی کا مالک تھا اور ان کی مجبوری تھی کہ وہ میرے احترام میں کھڑی ہو جائیں اور مجھ سے بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ نہی رہے۔ کمائی نے میرے آنے سے پہلے ہی میرے لیے ایک تیز طراری لیڈی سیکرٹری کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جسے میں نے پہلے دن ہی کسی ڈپٹی شیجر کے ٹیکشن میں منتقل کر دیا اور کمائی ہی کو اپنا پی اے بھی مقرر کر لیا۔ جانے یہ کمائی کی ترقی تھی یا سرتی، مگر وہ اس خدمت سے بہت خوش دکھائی دیا۔ کبیر خان میرے ساتھ ہی میری گاڑی میں دفتر آتا اور میری روانگی تک عمارت کے کسی گوشے میں یا بار گاڑی ہی میں میرا انتظار کرتا رہتا، مگر نہ جانے کیوں کمائی کی اس سے جان جاتی تھی۔ کمائی کئی بار مجھ سے دبے لفظوں میں یہ گزارش کر چکا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ دفتر کے اندر تک نہ لایا کروں، کیوں کہ بقول اس کے، کبیر خان کا اندازہ ہی بڑا خوف ناک تھا۔ اور خود کبیر خان کے بھی کمائی کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں تھے۔ "ہم کو یہ آدمی کچھ ٹھیک نہیں لگتا صاحب۔ یہ بڑا چالیس ہے اور خوشامدی لوگ اچھا نہیں ہوتا۔" وہ دونوں میرے لحاظ کا کہ وجہ سے ایک دوسرے کو برداشت کرتے آ رہے تھے۔ میں نے کبیر خان کو سمجھایا کہ یہ دنیا چلتی ہی خوشامد پر ہے۔ صدر سے لے کر کلرک تک سب کسی نہ کسی خوشامدی وجہ سے اپنی جگہ اور عہدے پر قائم ہیں۔ خوشامد شاید دنیا کا سب سے قدیم ہتھیار ہے، جس کی دھار کبھی بھی دور میں کند نہیں ہوتی۔

کچھ دن اسی ہنگامہ خیزی کی نذر ہو گئے مگر جیسے ہی کاروباری معاملات اپنی ڈگر پر آئے، میں نے ڈرائیور کو گاڑی نکال کر، اسے شہر کے وسط میں واقع ایک گنجان علاقے میں چلنے کے لیے کہا۔ ٹنگ سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم گھنٹہ بھر بعد ایک کھلے میدان میں آ گئے۔ سامنے ابھی تک وہی پرانا نشین کا بڑا سا نصف گولائی میں کھنڈا بوریٹ پڑا دینا تھا، "مستانہ گیراج" میری آنکھوں کے سامنے ماضی کے کئی دن، بیل بھریں لہر اگئے۔ ڈرائیور کو میں نے گاڑی گیراج کے احاطے میں لے جانے کو کہا۔ اس نے دبے لفظوں میں مجھے بتانے کی کوشش کی کہ کمپنی کی گاڑیوں کے لیے اپنا مخصوص ڈیلر اور گیراج شہر کے پوش علاقے میں موجود ہے، مگر میں نے سنی ان سنی کر دی۔ گیراج کے برآمدے میں گڑی کے ستون کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر وہی پرانا سارائیہ بولٹا ہوا تھا اور قضا استاد مستانے کے من بھاتے گانوں کی آواز سے گوشت روٹی تھی "جو درد دیا، اپنوں نے دیا، بغیروں سے شکایت کون کرے۔۔۔۔۔۔" گاڑی اندر داخل ہوتے دیکھ کر ایک شاگرد بھاگتا ہوا ہماری کار کی طرف آیا۔ "جی صاحب۔۔۔۔۔۔ تحکم کریں، ہر دوس کرئی ہے یا آئل بدلوانا ہے۔ نیوٹنگ بھی ہو جائے گی، پر آپ کی گاڑی کا انجن سیل بند ہے۔ کچھ وقت لگے گا ہماری ورک شاپ پر۔۔۔۔۔۔" یہ کوئی نیا لڑکا تھا۔ کچھ ڈور ہلائی کے ویڈیو ٹنگ پلانٹ پر اسی طرح ویڈیو ٹنگ میں بیٹھے ہوئے تھے، جیسے کبھی میں وہاں سارا دن بیٹھ کر اپنا فون ویڈیو ٹنگ کی چنگاریوں میں جلایا کرتا تھا۔ میں نے لڑکے سے سختی سے کہا "تمہارا استاد کہاں ہے؟" اس نے ہماری گاڑیوں کا ستیاناس کر دیا ہے، ٹھیک سے کام نہیں آتا ہے، جاؤ، بلا کر لاؤ۔" شاگرد گھبرا کر اندر کی جانب بھاگا اور چند لمحوں بعد استاد کی غصے میں بھری آواز سنائی دی۔ "اے کون سا سیسٹم ہے میاں! ہم بھی تو دیکھیں، استاد مستانے نے آج تک اپنے کام میں ہیرا پیمیری نہیں کی۔ ہم محنت کرتے ہیں، چوری نہیں کرتے۔" استاد مستانہ اپنے مخصوص حلیے میں سر پر دوٹی ٹوپی رکھے، واسٹک پہنے اور منہ میں پان دبائے بڑا اتنا ہوا برآمدے سے نکل کر گیراج کے صحن میں آیا اور ہماری گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے ڈرائیور اور کبیر کو گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہنے کو کہا اور خود نیچے اترا۔ میری آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا، جسے میں نے اتار کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ استاد بے خیالی میں غصے میں بھرا میری طرف بڑھا۔ میں منہ دوسری جانب موڑ کر کھڑا ہو گیا اور غصے سے بولا۔ "کیوں استاد مستانے۔۔۔۔۔۔ یہ گیراج ہے یا ہیرا پیمیری کا اڈا۔۔۔۔۔۔؟" مستانے کے سارے شاگرد برآمدے میں دم بخود کھڑے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب ان کا بچر کیلا استاد سب کچھ بھول کر کچھ پر چل پڑے۔ میرے تیز دیکھ کر کبیر خان کا ہاتھ ہوسٹر میں بندھے بے چل کی جانب بڑھ گیا۔

(جاری ہے)



.....باشم ندیم.....

باشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ٹلنک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز کی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہنا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب اس ظاہر پسند و زور پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رویوں، بد بیعت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مستحکم نہیں ہوئیے گا۔ ہمارا پتہ وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

استادستانے کے شاگردوں نے بھی اپنے طور پر آس پاس پڑے اور از بطور تھپرا اٹھا لیے، کیوں کہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کا استاد کیلای ہی ہم سے بھڑ جائے گا۔ تبھی میں نے پلٹ کر پھرے ہوئے استادستانے کی طرف دیکھا۔ ”کم از کم یہ سات سو سال پرانا ریڈیو تو بدل لینے استاد..... اب تو اس کے ارد گرد کا بھی جائیزہ میں سنائی دیتے ہیں۔“ استاد کا منہ گٹے کا ٹکڑا رہ گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ اپنی جگہ جامد ہو گیا اور پھر اس کی آنکھوں سے ایک جھڑی سی جاری ہو گئی اور دوڑ کر روتے ہوئے میرے گلے لگ گیا۔ ”اوہ وفا..... اتنے دن بعد اپنے استاد کی یاد آئی۔“ مجھے رفتی نے فون کر کے بتایا تھا کہ تم واپس آ چکے ہو۔ ”سارا گیراج ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا اور پھر چند پرانے شاگردوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور ہمارے گرد ایک ہتھکھاسا لگ گیا۔ استاد نے بڑی مشکل سے انہیں ڈانٹ کر کام پر لاگایا مگر وہ سب بہانے بہانے سے میری کار کے گرد پکڑ کاٹتے رہے۔ وہ سب جان چکے تھے کہ کل تک میں بھی انہی میں سے ایک تھا، مگر آج ان کے سامنے ان کے خوابوں کی تعبیر بنا کھڑا تھا۔ ہم کم زور اور بے بس انسان جنم سے لے کر قریب تک یہی کو کرتے رہتے ہیں، اپنے خوابوں کا چچھا، ان خوابوں کو ج کرنے کی دھن میں لگن..... مگر ہر ایک کے حصے میں تعبیریں بھلا کب آتی ہیں اور گیراج کے معصوم لڑکے یہ بات نہیں جانتے تھے کہ میں آج جو کچھ تھا، یہ کبھی میرا خواب نہیں رہا تھا۔ میں نے تو بہت جھوٹا سا پناہا تھا۔ بہت معصوم سا خواب تھا میرا، مگر اس کی تعبیر کے لیے جانے مجھے ابھی کتنے طویل رستوں سے گزرنے پڑے تھے کہ منزل ابھی تک لاپتہ تھی۔ شاید ہر انسان ہی کا مقدر، اپنے خوابوں کو کسی اور کے لیے تعبیر ہوتے دیکھنا ہوتا ہے اور اس کا اپنا خواب سدا کے لیے خواب ہی رہا جاتا ہے۔

استادستانے نے ننگڑے ہوئی سے میری پسندیدہ دودھ جتنی چائے منگوائی اور خود میرے سامنے بیٹھ کر ٹنگر ٹنگر مجھے دیکھنے لگا۔ ”تم نے تو واقعی کر دکھایا پیارے، ورنہ میرا تو کرامات سے یقین ہی اٹھ چلا تھا۔ جو تم نے چاہا، تمہیں مل گیا۔ ایسا دنیا میں کہاں ہوتا ہے بھلا۔“ میں نے مسکرا کر استاد کی طرف دیکھا۔ ”صرف تمہوڑی ہی دولت آگئی ہے، میرے پاس باقی کچھ نہیں بدلا استاد..... میں ابھی تک وہی پڑی زاو ہوں۔“ استاد نے بیٹھنا بدل کر کہا۔ ”کمال کرتے ہو تم، دولت سے بڑی تہیہ بھی کوئی اور ہوتی ہے کیا.....؟ لوگوں کی زندگیوں میں صرف ہو جاتی ہیں چند چھیلے کمانے میں۔ اب مجھ ہی کو دیکھو، سدا کے کنگال ہی رہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کوئی شادی وادی بھی کی ہے یا نہیں، یا ابھی تک وہی شریلے، کنوارے پڑی زاو ہو؟“ میں نے مزے دار چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ ”مجھ سے بھلا کون شادی کرے گی استاد، اور پھر شاگرد بیاہ کر لے اور اس کا استاد کنوارا رہے، یہ کہاں کا دستور ہے؟“ استاد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”کیوں اس غمر میں میری لٹیا ڈونے کی بات کرتے ہو پڑی زاو پیارے، اور یہ کیا بات کر دی کہ تم سے کون بیاہ کرے گی، ذرا اعلان تو کر کے دیکھو نکال کا، پورا سوئمبر بچے کا تھمارا تو.....“ میں نے استاد کی بات دوسری جانب موڑ دی۔ ”میری شادی کی بات چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ گیراج کا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ لگتا ہے برسوں سے رنگ و روغن نہیں کر دیا۔ کام والی گاڑیاں بھی اکاڑا کھڑی نظر آ رہی ہیں، جھن میں۔ یہ سب کیا ہے.....؟“ استاد نے میری بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”کچھ نہیں دھندے میں تو بھلا مندرا چلتا ہی رہتا ہے، تم سناؤ کیسی گز رہی ہے؟“ اتنے میں چائے کے برتن اٹھانے والے لڑکے نے ہماری بات سن کر راز کھول ہی دیا۔ ”پڑی زاو بھائی! گیراج تو، گروہی پڑا ہے ہمارا تین سال سے۔ استاد غلط بتا رہا ہے، کوئی دھند نہیں، صرف اتنا ہی مندرا ہے آج کل یہاں۔“ استاد نے آنکھیں دکھاتے ہوئے اسے بری طرح سے جھٹک دیا۔ ”تم بخت! اٹو! بائیں آئے گا بڑوں کی باتوں میں دخل دینے سے، چل دفع ہو، جا کر اس اٹھتر بیسی کروڑا کے ڈینٹ نکال۔ شام تک مجھے گاڑی تیار چاہیے، ورنہ کنگال اور چیز دوں گا تیری۔“ لڑکا منہ بسورتا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ ”یہ میں کیا سن رہا ہوں استاد! گیراج گروہی پڑا ہے، کیوں.....؟“ استاد نے ایک لمبی سانس بھری۔ ”اب کیا بتاؤ پڑی زاو! پرانے میکینک اور گیراجوں کا کام خسب ہو چکا ہے۔ گاڑیوں کے انجن اب سب بند آتے ہیں۔ نیونک اور مرمت کمپیوٹر والی مشینوں پر ہوتی ہے۔ ہائر بنا نیونک کے آگے ہیں اور خرداک کا کام اب ماؤرن مشین کرتی ہے۔ ہمارے پاس تو وہی چند پرانی کھٹارا گاڑیاں آتی ہیں، جن کا مزاج یہ بھی مشینیں سمجھ نہیں سکتیں۔ خرچے تمہارے سامنے ہی تھے سارے۔ ایسے میں گیراج گروہی نہ رکھتا تو کیا کرتا۔ مجھے اپنی فکر نہیں، بس یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں کہ گیراج کی قرقی یا تیل کی کے بعد نیا مالک کہیں ان انچوں کو بے روزگار نہ کر دے۔ تم تو جانتے ہو، ان سب کے گھر، ان ہی کے دم سے چلتے ہیں۔ کئی دفعہ ان سے کہا کہ کم بختو، جاؤ جا کر کوئی نیا دھند اٹھو..... پر، یہ ہیں کہ یہاں سے ملتے ہی نہیں۔“ میں پپ چاپ بیٹھا استاد کی ساری بات سن رہا۔ ”کس کے پاس گروہی رکھا ہے یہ گیراج تم نے.....؟“ استاد نے بے جا چوڑی سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ اسی علاقے کا ایک مارواڑی سیٹھ، بھلا آدمی ہے۔ قرقی کی تاریخ سے پہلے لگے نہیں کرے گا۔“ مجھے اس سیٹھ کا نام اور مکمل پتا چاہیے استاد۔ ”استاد نے انہی میں سر بلایا۔ ”نہیں پیارے! استاد اپنے شاگردوں کو دیتا ضرور لیتا کچھ نہیں۔“ میں نے استاد سے زیادہ بحث نہیں کی اور کمائی کو فون کر کے گیراج کو پہنچنے کو کہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ہڑ بڑایا سا گیراج میں موجود تھا۔ میں نے گیراج کے سب سے سینئر شاگرد کو کمائی اور ڈرائیور کے ساتھ سیٹھ کی طرف بھجوا دیا، جس کا پتا گیراج کے بھی لڑکے جانتے تھے۔ تین گھنٹے بعد ہی کمائی رہن رکھے گئے کاغذات کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ ”میں نے جانکا دی آڑاوی کے کاغذ استاد کی جھولی میں ڈال دیے۔“ یہ گیراج جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی میرا بھی ہے استاد۔ اگلے پتے تک نئی کمپیوٹر ڈرائیور مشین بھی آجائے گی اور تمہاری یہ ڈیوٹی ہے کہ اپنی گمرانی میں میرے اس گیراج کو ایک دم پٹاپ بنا دو۔ اگلی دفع جب میں اپنے گیراج کو دیکھنے آؤں، تو مجھے یہاں میرا پرانا استاد مستان چاہیے۔ ہاں، مگر یہ ریڈیو نہ بدلنا۔ اس کے پتا یہ گیراج مکمل نہیں ہوگا۔“ استاد مستانہم صم ماہاتھوں میں قرقی کھلنے کے کاغذات لیے بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کندھا چھو چھوایا اور اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے مڑا۔ استاد نے مجھے چھپے سے آواز دی۔ ”پڑی زاو.....“ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میرے گلے لگ گیا۔ میرے آس پاس گیراج کے سارے لڑکے جمع

ہو چکے تھے، کسی نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے، تو کوئی میرے شانے سے لگا کھڑا تھا۔ یہ کم بخت، بے جان اور کھر دے کا خنڈ کے چند روپے اپنے اندر رکھی خوشیوں پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔ کیسے کیسے کرب، کرشے دکھاتا ہے یہ پیسہ، روتوں کو بنسا دیتا ہے اور ہستوں سے گھنجر کر انہیں آٹھ آٹھ آٹسو لاتا ہے، اور یہ دولت مند کتنے ان جان رہتے ہیں، اس پیسے کے استعمال سے۔ کاش! ان بے جان کا خنڈ کے ٹکڑوں کا صرف ایک مصرف ہوتا، خوشیوں کا کاروبار۔ ان لڑکوں کے چہروں پر ایسی خوشی تھی کہ جس کے بدلے ساری دنیا کی دولت بھی لٹا دی جاتی تو کوئی گھائے کا سودا نہ ہوتا مگر عموماً قدرت جنہیں دولت دیتی ہے، بدلے میں ان کا دل نکال لے جاتی ہے، شاید اسی لیے یہ نیا دل والوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

گھیراج سے نکلنے نکلنے سد پھر کے چار بج گئے۔ دفتر جانے کا وقت تو رہا نہیں تھا، میں نے ڈرائیور کو گاڑی گھر کی طرف موڑنے کا کہہ دیا اور پھر واپسی پر میری نظر اپنی پرانی یونیورسٹی کے بورڈ پر پڑی۔ میں نے گاڑی کو گاڑی اور کچھ دیر کے لیے نیچے اتر کر گیسٹ سے اندر چلا گیا۔ اس درس گاہ میں، میں نے اپنی زندگی کے چند اچھے دن گزارے تھے، اچانک ہی میرے اندر خود میرے ہی ہاتھوں دھنیا ہوا، وہ ایک ناکام سا شاعر جاگ اٹھا، جس کے کلام پر داد و تحسین سے کبھی وہ سامنے نظر آنے والا بڑا آڈیٹوریم گونج اٹھتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ دینی جاتے وقت میں اپنی ساری نظمیں اور کلام ٹھن کے ایک کيسے میں بند کر کے اپنے پرانے گھر کے چھت والے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ جانے اب وہ سارے رجسٹر اور کاغذوں کے دستے کہاں ہوں گے۔ کاش! میں وہ سب اپنے ساتھ ہی دینی لے جاتا۔ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ میرے عقب میں ایک مانوس سی بھاری آواز گونجی۔ ”تم نہ ی زاد ہونا۔“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے عقب میں کھڑی میری گاڑی سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ شیروانی اور جناح ٹوپی پہنے کھڑے تھے اپنی نظر کے خشنے کے پیچھے سے تنگ کی باغیچے دیکھ رہے تھے۔ ”جی..... میں نہ ی زاد ہوں..... مگر آپ.....؟“ وہ میری طرف بڑھے۔ ”بھول گئے، یادداشت کی کم زوری تو بڑھا پے سے مشروط ہوتی ہے، مگر میں نے تو تمہیں پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا۔“ میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ”مجھے پہچاننا تمہارے جانے کے بعد اردو پریم اب کا شعبہ بھی میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ تمہاری کہی ہوئی نظمیں آج تک جامعہ کے ادبی پرے میں چھپی رہتی ہیں اور تمہاری وہ اسٹیج ڈرامے والی نظم ”مگر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....“ ہر سال جب بھی اوتھیلو اسٹیج کیا جاتا ہے، پس منظر میں تمہاری وہ نظم ضرور رہائی جاتی ہے۔“ میں خاموشی سے احمد صاحب کی بات سن رہا تھا۔ میرا دل جا پا کہ انہیں بتا دوں کہ میں وہ شاعری بھی کسی خاص مقصد سے کیا کرتا تھا۔ کالج کی چند مہینوں میں اک ذرا سی توجہ حاصل کرنا مقصد تھا میرا، اور میں..... انہوں نے فور سے میری طرف دیکھا۔ ”مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی تم اچانک یونیورسٹی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے، تعلیم مکمل کی یا نہیں؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”کچھ مجبوریاں تھیں سر، مجھے دینی جانا پڑا۔“ سر احمد نے پلٹ کر میری قیمتی گاڑی اور گاڑی کی طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے، تم نے وقت ضائع نہیں کیا وہاں، لیکن تم یہاں باہر لان میں کیوں کھڑے ہو، اندر چلو۔ بہت سے طالب علم تم سے ملنا چاہیں گے۔ شعبہ اردو میں اکثر تمہاری نظموں پر بات چلتی ہے۔“ میں نے طریقے سے معذرت کی۔ ”نہیں سر..... آج نہیں، یہ میرا کارڈ ہے۔ کبھی فرصت ملے تو میرے دفتر چکر لگایے گا۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

یونیورسٹی سے گھر واپس آنے کے بعد بھی، میں بہت دیر تک یونیورسٹی کی یادوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا۔ مجھے وہ نٹ کھٹ سی لہنی بھی یاد آتی۔ جانے اب وہ کہاں ہوگی۔ سینٹھ عابد سے شادی کے بعد کسی اک کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا تھا۔ لہنی کی ماں کے ایک جیل سے میری زندگی کے تمام راستے بدل دیے تھے، مگر میں دولت کمانے کی دھن میں ایسا گمن ہوا کہ اپنے اندر بسنے والے اس حساس اور نازک انسان کو کبھی کھل کر رکھ دیا، جو کبھی میرا سب سے اچھا دوست تھا، لیکن اس ساری تنگ دود سے مجھے کیا ملا۔ میں تو آج بھی اتنا تنگ تھا اور اکیلا تھا، نہ کسی کے حرف و عا میں تھا، نہ کسی کے دست طلب میں..... نہ کسی کی آنکھ کا نور تھا، نہ کسی کے دل کا قرار..... مجھے ٹیڑس پر بیٹھے جانے لگتی دیر ہو چکی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل کر شام کو رات کی سیاہ چادر میں لپیٹ رہا تھا۔ لوگ دن اور رات کو ایک دوسرے کی خدمت کہتے ہیں، مگر مجھے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی لگتے تھے، پتلے دوست..... چھٹی توجہ جب دن شد بد سنگھن سے چو رہو کر شام تک پہنچنے لگتا ہے، جب شام اپنی مہربان سبلی، رات کو آواز دے کر بلاتی ہے اور رات اپنی کالی شال میں اس تھکے ماندھے دن کو سیت کر ملا لیتی ہے۔ یوں شاید ہر رات کی گود میں ایک بھرپور دن آنکھیں موندے سو یا رہتا ہے، بس ہمیں ہی نظر نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے آکر بتایا کہ کمالی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کمالی ٹیڑس پر آیا تو معمول سے کچھ زیادہ پر تکلف لباس میں ملیں تھا۔ ”کیا کسر.....؟“ آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے، ہمیں سیٹھ رحمان کے فارم

ہاؤس جانا ہے، پارٹی میں۔ شام سے تین مرتبہ وہ خود مجھے یاد دہانی کروا چکے ہیں کہ یہ دعوت خاص طور پر آپ کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔“ میں نے جان بگھڑانے کی کوشش کی۔ ”میرا موڈ نہیں ہے کمالی، تم میری طرف سے کوئی مناسب معذرت پیش کر دیتا۔“ کمالی گڑبڑا سا گیا۔ ”نہیں سر! اچھا نہیں لگے گا، سارے شہر کے امراء وہاں اکٹھے ہوں گے اور پھر ہمیں وہاں اپنے نئے ٹینڈرز کے امیدواروں سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔“ نیا نیا کاروبار ہے اپنا سر۔ یہ میل جول رکھنا ضروری ہے۔“ میں نے بالآخر اسے خود کو بڑی مشکل سے آمادہ کیا اور گھٹنے بھر بعد ہم سیٹھ رحمان کے فارم ہاؤس کی راہ پر گامزن تھے۔

آج کل امیروں کا یہ ایک نیا مشغلہ بننا جا رہا ہے۔ شہر میں ٹھیک خاک عالی شان گھریا جائے اور ہونے کے باوجود کسی دیرانے میں ٹیکڑوں اٹکڑا راضی پر ایک فارم ہاؤس تعمیر کیا جاتا ہے، جہاں ایسی ہی کاروباری اور غیر رسمی دعوتیں رکھی جاتی ہیں۔ یہ فارم ہاؤسز ایک طرح سے امراء کا انٹیمس سہل بھی ہوتے ہیں اور کچھ خاص لوگوں کے لیے پروے کا کام بھی کرتے ہیں۔ سیٹھ رحمان کا فارم ہاؤس بھی کچھ ایسا ہی پر وہ محسوس ہوتا تھا۔ کئی ایکڑ گھاس کے میدان اور گالف کورس کے درمیان بنی شیشے کی عمارت، جس کے آس پاس مصنوعی نہروں اور فواروں کے ذریعے پانی کے بجائے کا انتظام موجود تھا۔ انسان مادی طور پر چاہے جتنی بھی ترقی کر لے۔ پانی اور سبزہ واس کی جبلت سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ ہمارے ذہنوں میں بخت کا تصور بھی تو بہت ہی نپروں، ٹھنڈے چشموں اور گھٹے

سایوں ہی کی صورت نقش ہے۔ سارا فارم باؤس برقی قہقروں سے جگدگا رہتا تھا، بارہائی کیو کا بندوبست بھی باہر بڑے ہی میں کیا گیا تھا۔ میں وہاں موجود لوگوں سے صرف نام کی حد تک ہی واقف تھا، مگر گلن شاہ کمالی نے میرا کافی تفصیلی تعارف کر دیا تھا۔ جیسی وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میری کمپنی اگلے مہینے ایک بہت بڑا آرڈر ریڈ کر کے والی تھی۔ معیاری آلات کی فراہمی اور ایک نئی جدید ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے بیس بہت بڑی مالیت کا تحفہ دینا تھا اور وہاں پارٹی میں موجود سبھی کاروباری طبقے اس ٹھیکے میں دل چسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ سینٹر رحمان پچاس پچپن سالہ

ایک گھاگ اور شوقین مزاج شخص تھا، جسے بائیں ہاتھ کے نشن سے کافی آگاہی تھی۔ اس نے فردا فردا سبھی مہمانوں سے میرا تعارف کر دیا اور وقتاً فوقتاً اپنی گفتگو کے دوران مجھے یہ بتانے میں قلعاً عار محسوس نہیں کی کہ وہ ہماری کمپنی کے ٹھیکے میں کافی دل چسپی رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کمالی جس طرح سینٹر رحمان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا، اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کمالی کو کبھی خوش کر رکھا ہے۔ "کیا بتاؤں سر جی..... یہ اپنے رحمان صاحب تو یاروں کے یار ہیں، بڑا ہانگلا رہتا ہے، ان کے فارم باؤس پر۔ صوبائی اور وفاقی وزراء اور نوکر شاہی تو سمجھیں کہ بس ان ہی کی دل دادہ ہے، آج بھی جو کافی فستوز اور سیکرٹریز آپ کو اس دعوت میں نظر آ رہے ہیں، یہ ان ہی کا کمال ہے۔ سبھی کو خوش رکھنے کا فن تو کوئی رحمان صاحب سے سیکھے۔" کمالی کی زبان قیمتی کی طرح چل رہی تھی۔ اس محفل میں مجھے ایک اور ادراک ہوا۔ اخلاقیات اور شرم و حیا کے معیارات ہر طبقے میں اپنے اپنے طور پر طے اور رائج شدہ ہوتے ہیں۔ محفل میں زرق برق اور جھلجھل کرتے ملبوسات میں خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو اس آزادانہ ماحول میں یہاں وہاں اخلاقی پھر رہی تھیں اور ان میں زیادہ تر وہ تھیں، جو کسی نہ کسی بڑے آدمی کے ساتھ بطور "دوست" اس محفل میں شریک تھیں۔ تعارف کے دوران ان میں سے اکثر نے مجھ سے بھی منسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ کبھی مشرقی اقدار میں زنانے اور مردانے کا رواج ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں اور لوہاؤں کی محفلوں اور دعوتوں میں مرد اور خواتین الگ الگ حصوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ دولت کی فراوانی کا ان بدلتی قدروں سے کوئی تعلق نہیں تھا، کیوں کہ دولت اور پیسہ ان کے پاس آج کے ان وقتوں سے کہیں زیادہ تھا، تو پھر یہ آزاد خیالی اور بے جا بلبی ہمارے معاشرے میں کہاں سے ڈرائی۔ چونکہ انسان کی ابتدا پتھر کے دور سے ہوئی تھی، تو شاید اس کا اعتقاد بھی پتھر کے دور ہی پر ہوگا۔ درمیانی مدت مکمل عروج اور پھر یکسر زوال کا کھنٹا ایک دور رہا یہی تو ہے، کھانے سے پہلے ہر طرح کے غیر ممنوعہ اور ممنوعہ مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ انسان خدا سے ہمیشہ عقل اور ہوش مندی کا طلب گار رہتا ہے تاکہ زندگی متوازن اور خوش گوار گزار سکے، مگر شام ہوئے ہی، ہم میں سے اکثر اس ہوش مندی سے گھبرا کر خود کو مدہوشی کے اندھیرے کنوئیں میں کیوں اتار لیتے ہیں، مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ میرے ارد گرد مصنوعی مدہوشی کا دور دورہ تھا، عارضی اور جھمونی بے خودی۔

میں نے اکتا کر کمالی کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے لپک کر میرے قریب آیا۔ "اتنی جلدی سر..... کھانا نہیں لگنے ہی والا ہے۔ سینٹر رحمان کو کسی خاص مہمان کا انتظار ہے۔ ان کے آتے ہی کھانا منجن دیا جائے گا۔" میں نے اکتا ہٹ سے کمالی کی طرف دیکھا۔ "ہماری حاضری لگ گئی ہے، تم اب یہاں سے لگنے کی کرو۔" کمالی نے سر ہلایا اور سینٹر رحمان کو روانگی سے مطلع کرنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے ابھی کار پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی جانب سے رحمان، کمالی کے ساتھ تیز اور لمبے ڈنگ بھرتا ہوا نمودار ہوا۔ "یہ کیا پی، زید صاحب! آپ ابھی سے چل دیے۔ ابھی تو شام اور محفل خفک طرح سے بھیگی بھی نہیں....." میں دیر سے سے مسکرایا۔ "میں شام دیر تک اوس میں بیٹھتا رہوں، تو مجھے زکام ہو جاتا ہے۔ بیٹھنے کے معاملے میں کم ظرف واقع ہوا ہوں نہیں۔" سینٹر میری بات سن کر زور وارتقہ لگا کے ہنسا۔ "خوب..... بہت خوب....." بھی میں تو سمجھتا تھا کہ پورے شہر میں، صرف ایک میں ہی بذلہ رنج باقی بچا ہوں، مگر آج اپنا مقابل دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اب تو میں آپ کو ہرگز اتنی جلدی والی نہیں جانے دوں گا، محفل کے بعد بیٹھ کر آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ برسوں بعد کسی ہم زاد سے واسطہ پڑا ہے۔" میں نے بہت جان ٹھوکرانے کی کوشش کی کہ "کل ایک اہم پروجیکٹ کے لیے میٹنگ کی تیاری کرنی ہے، مگر سینٹر رحمان اڑ گیا۔" نہیں، بھی، ابھی تو آپ کو اس محفل کی جان سے ملوانا ہے، دھ پارہ بیگم..... چوٹی کی ایکسٹریس ہیں..... بڑی دھوم مچائی ہے انہوں نے نظم اندسری میں۔ ویسے تو وہ کبھی کسی پبلک پلیس پر یوں آتی جاتی نہیں، مگر ہمارے ساتھ کچھ دیر یہ مراسم کا خیال ہے انہیں، اسی لیے آ رہی ہیں۔ یہ لیس، شاید یہ ان ہی کی گاڑی ہے، وہ آگئیں، آپ بس دو لمحوں انتظار کریں۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے ان سے..... وہ خود بھی بہت مشتاق تھیں آپ سے ملنے کی۔ سچ پوچھیں تو وہ صرف آپ سے ملنے ہی آ رہی ہیں۔" سینٹر رحمان جلدی سے آگے بڑھ گیا اور میرا سوال میرے سن ہی میں جھل کر رو گیا کہ وہ بھلا مجھے جانتا ہی کتنا تھا کہ اسے میری تعریف کی ضرورت پڑ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سینٹر رحمان ایک زرق برق، ناز وادا کے بیکہ کو لیے میری طرف آنا نظر آیا۔ میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر ساتھ چلتی عورت پر پڑی تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اس عورت کو جانتا تھا، مگر تب اس کا نام ش پارہ نہیں تھا۔ ش پارہ کی نظر میری نظر سے ٹکرائی، تو وہ بھی ایک جھٹکے سے ٹھٹھک کر وہیں جم گئی۔

(جاری ہے)

بائیں ہم نیکم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ٹلنک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پٹی برائی حاصل کی، توجہ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز ٹیڑھی ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رویوں و بدینت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مست محمول ہے گا۔ ہمارا چاہوی پڑتا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سیٹھ رحمان کے ساتھ آنے والی عورت لٹنی تھی۔ ہاں وہی میری یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت اور طرح دار لٹنی، جس کی شادی سیٹھ عابد نامی ایک دولت مند کباڑیے سے ہوئی تھی، سیٹھ رحمان ہم دونوں کی کیفیت سے بے خبر ہمارا تعارف کروانے میں مصروف تھا۔ ”شہد پارہ بیگم! ان سے ملیں، یہی ہیں، پی زیڈ صاحب اور؟“ کل شہر میں بس انہی کے چرچے ہیں اور یہ ہیں شہد پارہ... ہمارے ملک کی نام ور آرٹسٹ، پڑوسی ملک میں بھی اپنی اداکاری سے دھوم مچا چکی ہیں۔ آج ہم نے خاص؟ پ سے ملاقات کے لیے انہیں مدعو کیا ہے۔“ لٹنی پپ چاپ کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ ”ہماری پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے رحمان صاحب، مگر تب یہ پی زیڈ نہیں تھے اور نہ میں شہد پارہ۔“ سیٹھ رحمن کو شہد پارہ کی بات سن کر حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ ”ارے... واقعی... بھئی پی۔ زیڈ صاحب، آپ تو واقعی مجھے رستم لگے، جب کہ ہم یہ سمجھتے رہے کہ اس گوہر نایاب سے دوستی کا شرف صرف ہمیں ہی حاصل ہے۔“ لٹنی عرف شہد پارہ نے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھ کر کہا ”میں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیجیے رحمان صاحب... پڑانے چھڑے ہوئے ملیں، تو کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے دونوں کے درمیان۔“ سیٹھ رحمان لٹنی کی بات سن کر ہڑ بڑا کے بولا ”ہاں ہاں، کیوں نہیں، آپ لوگ باتیں کریں، میں کانٹا لگوانے کا انتظام کرتا ہوں۔“ سیٹھ رحمان جاتے جاتے بھی نہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ لٹنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے قریب آگئی، ”پری زاو... یہ تمہی ہوناں! اچھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا، تو تم ہوشمر کے وہ نئے بگ شات، بڑے صنعت کار، میرا تعلق اب فلم انڈسٹری سے ضرور ہے، مگر ایسا میں نے صرف فلموں ہی میں ہوتے دیکھا ہے۔ تم واقعی ایک فارج ہو پڑی زاو...“ ”میں نے لٹنی کی طرف دیکھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی خوب صورت اور جاذب نظر تھی، بلکہ اس کے حسن میں اب اداسی کی آمیزش نے ایک عجیب سا رنگ بھردیا تھا۔ حسن اداس ہو تو کتنا مکمل ہو جاتا ہے۔“ ”نہیں، نہیں کبھی فارج نہیں رہا، بس ہارتا ہی آیا ہوں، مگر تم اور یہ شہد پارہ، یہ سب کیا ہے تمہارا شوہر کہاں ہے، وہ سیٹھ عابد...؟“ ”لٹنی دھم سے مسکائی۔ ”سیٹھ عابد ایک کامیاب سوداگر تھا۔ اسے جب تک شادی کے سودے میں اپنا فائدہ و نظر آیا، اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا اور جب نو دسیت سارا منافع وصول ہو گیا، تو تین لفظ کبھڑ کر آڑا کر دیا۔ تم نہیں جانتے پڑی زاو، اسے سودے بازی خوب آتی تھی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسا سودے باز تھا۔“ لٹنی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”اوہ! اس کا مطلب میرا شک صحیح تھا۔ اس نے تم سے بھی تمہاری شاعری کا سودا کیا تھا ناں، مجھے ہمیشہ اس کے نام سے ٹھٹھی اس کتاب کے لفظوں میں تمہاری جھٹک نظر آتی تھی، مگر میں خود کو کبھی یہ یقین نہیں دلا پائی کہ تم اپنے فن کو سیٹھ عابد جیسے کسی دکان دار کے ہاتھ بیچ سکتے ہو؟“ ”میں نے لٹنی کی سیاہ غرائی آنکھوں میں مجھے سوال کا جواب دیا۔ ”ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ سیٹھ عابد ایک بہت کامیاب سوداگر تھا۔ اسے ٹھیک وقت پر اپنے مطلب اور لوگوں کی مجبوریوں کی قیمت لگانا خوب آتا تھا، بیچ پوچھو تو آج جو تم مجھے پی زیڈ سے اپنی زیڈ صاحب بنا دیکھ رہی ہو، اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں سیٹھ عابد سے کیے ہوئے اس سودے کا بھی ہاتھ ہے۔ مگر تم یہاں اس محفل میں کیسے، یہ سیٹھ رحمان تو بڑا کاناں ٹھٹھٹھ دیکھائی دیتا ہے، اور تم اس کی خاص مہمان ہو، یہ سب کیا ہے؟“ ”لٹنی نے ذر کھڑے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھا، جو مہمانوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ ”یہ سیٹھ بھی ایک کامیاب دکان دار ہے، اس نے مجھے تمہیں رجھانے کے لیے؟ آج یہاں مدعو کیا ہے۔ تمہاری فرم سے کوئی ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب میرا مصروف ان بڑے صنعت کاروں کے ہاں بس اتنا ہی رہ گیا ہے۔“ میں نے دکھ سے لٹنی کی طرف طرف دیکھا۔ ”اور فرض کرو تم مجھے رجھانے میں ناکام رہتیں، پھر... پھر کیا ہوتا؟“ ”کچھ زیادہ نہیں، میری بچی گچی عزت نفس کو بھروسہ کیا جاتا اور پھر کسی اور سودے کے لیے پیش کر دیا جاتا، کیوں کہ میری ماں دینا سے جاتے جاتے اتنے اوجھا میری ذات کے لیے چھوڑ گئی ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو ان زنجیروں سے خود کو آزاد نہیں کر سکتی۔“ اتنے میں سیٹھ رحمان ہمارے قریب پہنچ گیا۔ ”مخل ہونے کی معذرت چاہتا ہوں، مگر کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ باتوں کے لیے تو ساری رات پڑی ہے، اور پھر مجھے تو لگتا ہے کہ شہد پارہ بیگم ہم سے کہیں زیادہ آپ کی باتوں کی قدر دان ہیں، ورنہ اتنی لمبی گفتگو تو کسی سے نہیں کرتیں۔ ہم تو بات کرنے کو ترس جاتے ہیں صاحب...“ ”میں نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ ”میں نے سیٹھ صاحب اب میں چلوں گا،؟ پ کا کھانا شاید مجھ سے ہضم نہ ہو سکے۔ کل؟ اپ اپنے منیجر کو میرے دفتر بھیج دیجیے گا۔ یہ ٹھیکہ آپ ہی کو ملے گا اور یہ کیا، اس جیسے مزید جتنے سودے آپ کرنا چاہیں، میری طرف سے ہاں ہی کہیے گا۔ بدلے میں مجھے صرف کسی کی؟ آزادی درکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کے لیے کھانے کا سودا نہیں ہوگا۔ اگر منظور ہو تو اپنے منیجر کو قیامت بنا کر بھیجے گا۔“ میں بات ختم کر کے وہاں سے چل پڑا اور سیٹھ رحمان ہکا بکا سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ مزے وقت میں نے لٹنی کی آنکھوں کی نمی، اپنی؟ آنکھوں میں آنٹی محسوس کی تھی اور پھر ساری رات اس نمی نے میری چٹکیں بھگوئے رکھیں۔ بظاہر باہر سے آجلی اور؟ آنکھوں کو میسر نہ کر دینے والی چمک لیے یہ دینا اندر سے کبھی کبھی تھکی تاریک اور سیاہ لگتی ہے۔

اگلے روز سیٹھ رحمان کا منیجر اپنے وقت پر آن پہنچا۔ واقعی سیٹھ رحمان ایک کامیاب سوداگر تھا۔ مگر نہ جانے کیوں پھر بھی اس کی لگائی ہوئی قیمت مجھے بہت کم محسوس ہوئی۔ لوگ عموماً جسموں کے سودے کرتے وقت ان کے اندر انہی روح کی قیمت لگانا بھول جاتے ہیں۔ کمائی پھیلے دو چار دن سے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس روز سیٹھ رحمان کے منیجر کے جانے کے بعد اپنی پپ پر قابو نہیں رکھ پایا ”اگر آپ بڑا نہانا نہیں سرتو میں ایک بات کہنے کی جرات کرنا چاہتا ہوں، عہدے اور رتبے میں؟ آپ مجھ سے بہت بلند ہیں، مگر غرض میں، میں آپ سے بڑا ہوں۔ لہذا مجھے میرے تجربے کی رعایت دیتے ہوئے کچھ عرض کرنے دیں۔“ میں نے اطمینان سے اس کی یہ لمبی تمہید سنی۔ ”مختی دیر میں تم نے یہ تمہید باندھی ہے، ہم اپنی بات ختم بھی کر سکتے تھے۔“ کمائی میری بات سن کر مسکنا سا گیا۔ ”جی سر... میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے سیٹھ رحمان کی بہت زیادہ قیمت لگا دی۔ میں جانتا ہوں، یہ آپ کا ذاتی پیسہ ہے، اور اسے خرچ کرنے کا حق بھی صرف؟ ہی کو ہے، مگر آپ کو ابھی سودے بازی نہیں؟“ ”میں جب آپ کو یوں بے دروغی دوسروں پر پیسا لٹاتے دیکھتا ہوں، تو نہ جانے کیوں بہت دکھ ہوتا ہے۔ غمیں لگ جاتی ہیں، یہ پیسا کمانے میں۔ اس طرح تو آپ خود کو بہت جلد برباد کر دیں گے۔ اگر جذبات میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے، تو میں معافی چاہتا ہوں، مگر میں نے آپ کو خبردار کرنا؟ پنا فرض سمجھا۔“ کمائی بات ختم کر کے پپ ہو گیا۔ ”تم نے ٹھیک کہا کمائی! مجھے سودے بازی نہیں آتی، اچھا سوداگر نہیں ہوں میں۔ انسانوں کی قیمت لگانا نہیں جانتا، کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ قیمت صرف چیزوں

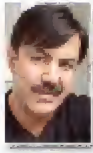
اماں کی ہانپوں کو ڈانٹنے اور سکھو اپنے گھر کو سکھانے کی آواز میں آتی رہتیں۔ اباحسن میں اپنا حق سنہا لے لکھائے اور اخبار پڑھتے رہے۔ میں منی کے صحن میں اپنی پرانی ٹین کی بنی کھلو تا موٹر کار کے لیے راستے جانا تا رہتا اور دن میں موسموں میں اس رنگ لگی کار کو اماں کے دوپٹے سے چکا تا رہتا، ایک لمحے ہی میں میرے آس پاس یہ سب کچھ اس شدت سے میری یاد کے جھروکوں سے باہر چھلکا کر وہ سب لمحے پھر سے زندہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ میں اس وقت اماں کے حقے کا کڑا دوا دھاں اور باورچی خانے سے آتی گرم بھلکوں کی مہک بھی محسوس کر سکتا تھا۔ کاش میں ساری زندگی وہی پانچ چھ سالہ بڑی زاوی رہتا، کبھی بڑا نہ ہوتا۔ جانے ہم اسی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟ ہر بچہ اپنی ماں کے لیے بڑی زاوی رہتا ہے تو اگر میری بھولی بھالی ماں نے مجھ جیسے کا نام بھی بڑی زاوی رکھ دیا تو ایسا کیا گناہ کیا۔ میری؟ انکھوں سے نمپ آ سو بہنے لگے۔ اچانک مجھے اپنے کانوں میں ابائی؟ واڑ بھی کوئی محسوس ہوئی۔ ”بڑی زاوی... جیٹا... تم بڑی زاوی ہو ناں“ میں ایک جھٹکے سے اپنے خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ کوئی مجھے واقعی پکار رہا تھا۔ جسے میں ابائی آواز سمجھا تھا، وہ ہمارے محلے کے ایک بزرگ بشیر چچا کی آواز تھی، میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ کر پلٹ کر دیکھا۔ گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر کھلی سے گزرتے کچھ پرانے محلے دار علی میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے، جن کے ہاتھوں میں میرا بچپن کھپا تھا۔ سبھی گھل مل گئے اور بڑی یادوں کے سب در تپتے وا ہو گئے۔ وہ سب اباکے دوست اور ساتھی تھے اور بڑائی باتیں یاد کر کے کبھی بیک وقت خوش اور غم گین سے ہو گئے تھے۔ گو یا یاد ماضی صرف میرے لیے ہی عذاب نہیں تھی، اور بھی بہت تھے، جو اس عذاب سے دوچار تھے۔ وہ سب میری ترقی و یکہ کر جہ اور دل سے خوش نظر آ رہے تھے۔ یہ پرانے محلے دار بھی

بڑے دل چپ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ جب تک ساتھ رہتے ہیں، زیادہ تر ایک دوسرے سے نکلنا اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، مگر انہی میں سے جب کوئی ایک گھڑ کر کہیں اور چلا جاتا ہے اور عرصے بعد ملتا ہے، تو یہ سارے خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر اسے یاد کرتے ہوئے ہوں استقبال کرتے ہیں، جیسے وہ ہم سارے نہیں، کوئی ماں جایا ہو۔ یہ انسانی رشتے ہمیشہ دور جا کر سی خوب صورت کیوں بن جاتے ہیں؟ غافلے ہمارے رویوں میں اتنی بڑی تبدیلیاں کیسے لے آتے ہیں۔ یہ کیا گورکھ دھندلے؟ کنگڑا والے منظور چچا کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔ ”ارے ہاں بڑی زاد دینا! او مرزا صاحب کا پوچھنے ضرور جانا۔ بہت بیمار رہتے ہیں آج کل، ضعیف بھی بہت ہو گئے ہیں۔ مرزا صاحب کا نام سنتے ہی میرا گال اچانک جلنے لگا۔ ان کا لگا یا ہوا طمنا آج تک میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں گونج رہا تھا اور تب ہی اچانک ہی وہ ”افس جان، ناہید یاد آ گئی۔ اس کا تو ماجد سے رشتہ ہو گیا تھا۔ جانے اب وہ کیسی ہوگی؟“

محلے کے بچے میری گاڑی کے گرد جمع تھے اور ذرا نیور انہیں بھگانے کے لیے مختلف طریقے آزمایا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ مرزا صاحب کے دروازے کے سامنے دُک گیا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی حالت پر فحسی آ گئی۔ اب تو وہ کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور میں ہوں کہ آج بھی اس کے گھر کے سامنے کھڑا اپنے بے چین دل کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوں۔ سب اس دشمن دل کے قماشے ہیں۔ میری دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی کے قدموں کی آہٹ بلند ہوئی۔ میں ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والی نے دروازہ کھولا تو اس کی نظر مجھ سے پہلے زور کھڑی میری کار پر پڑی، اور پھر میری نظر اس کی نظر سے ملی تو جیسے سانس رکنے لگی۔ وہ ناہید ہی تھی۔ ناہید بھی گز بڑا سی گئی۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ ”آپ!... آپ بڑی زاد ہیں ناں۔ مجھے ہم ساریوں نے بتایا تھا کہ آپ محلے میں آئے ہوئے ہیں، مگر میں بالکل بھی یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ آپ ہمارے گھر بھی آئیں گے۔“ ناہید کے بال الجھے، کپڑے مسلے ہوئے اور چروں میں بڑی پانی چٹل تھی۔ اس کا جسم پہلے سے کافی فریگ رہا تھا اور وہ طرح دار، شوخ، نازک اور نف کھٹ سی لڑکی، مجھے اس سامنے کھڑی عورت میں پہ مشکل ڈھونڈنے سے حصے جڑوں میں نئی نظر آ رہی تھی۔ ناہید نے سٹ پنا کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ ”آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آ جائیں۔ اب گھر پر ہی ہیں۔“ میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ یہی صحن تھا، جہاں میں کبھی شام کو گھنٹہ بھر کے لیے ناہید کو نیوٹن پڑھانے انکوری نل کے سامنے میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا اور دن کے باقی تھیس گھنٹے، اسی ایک گھنٹے کی یاد میں گزرا دیتا تھا۔ صحن میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے شور اور اوجھم چارہ تھے۔ ان میں سے ایک نے گھڑے پر رکھا جیش کا گلاس زور سے کپے فرش پر گرا دیا تو شور مچ گیا۔ ناہید نے غصے میں اس بچے کو دو ستر مارے اور شرمندگی سے چلائی۔ ”چپ کر جاؤ کم بختو! کچھ نہیں رہے، گھر میں مہمان آئے ہیں۔ چلو، نکلو یہاں سے۔ باہر جا کر کھیلو۔“ بچے منہ بسور تے صحن سے نکل گئے۔ اندر سے مرزا صاحب کھانسنے ہوئے باہر صحن میں نکل آئے۔ ”کون آیا ہے، ناہید بیٹا!...“ ناہید نے جلدی سے صحن میں

پڑی بڑی اتنی کرسی میرے لیے سیدھی کی ”بڑی زاد!؟“ نے ہیں اباجی، ہمارے پرانے ہم سامنے۔“ مرزا صاحب نے چونک کر اپنا چشمہ درست کیا اور مجھے غور سے دیکھا۔ ”ارے بڑی زاد بیٹا! کیسے ہو تم تمہارے بھائیوں سے پتا چلا تھا کہ تم پاکستان آ چکے ہو۔ اچھا کیا آ گئے، جہیں دیکھے بہت عرصہ ہو گیا۔“ مرزا صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ناہید میری موجودگی کی وجہ سے بہت الجھی ہوئی اور بے آرام سی دکھائی رہی تھی۔ پھر اچانک مرزا صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ ”ارے ہاں، یاد آیا۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کر دی تھی میاں۔ بعد میں حقیقت کھلی تو تم یہاں سے جا چکے تھے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بزرگوں کا حق ہوتا ہے۔ مگر یہ ماجد کہاں ہے، دکھائی نہیں دے رہا۔“ مرزا صاحب نے نہ اسامہ بتایا ”ارے ہوگا کہاں...“ کہیں نوکری کی تلاش میں در بدر بھٹک رہا ہوگا۔ ناہید کی ماں کے انتقال کے بعد اسے تو موقع ہی مل گیا۔ مینوں اپنے بیوی بچوں کو یہاں میکے میں میری خدمت کے بہانے چھوڑ کر جانے کہاں غائب رہتا ہے۔ بہت سے کاروبار آزمائے اس نے، مگر کچھ نہیں۔ ”اج کل نوکری کے لیے دھکے کھاتا رہتا ہے۔“ ناہید چائے کا کپ لیے نمودار ہوئی اور اس نے باپ کو گھور کر دیکھا۔ ”بس کریں اباجی، یہ وقت بھلا ان باتوں کا ہے؟“ ”نہیں کن اکھیوں سے ناہید کو دیکھتا رہا۔ یہ نازک شاخ گل جیسی لڑکیاں شادی کے بعد اتنی جلدی اپنا زو پ کیوں بدل لیتی ہیں، یا پھر شاید، ماجد جو اس کا محبوب تھا اور بطور شوہر اس کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، اس کے لیے ناہید اب بھی اتنی ہی دل کش اور خوب صورت ہو۔“ کہتے ہیں کہ جس جب ہمارے روزمرہ کے معمول میں شامل ہو جائے، تو عموماً اپنا اثر کھودیتا ہے، یا پھر سدا کے لیے اپنے پہلے تاثر کے ساتھ ہماری یادداشت میں جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں نے پورے دس سال کے بعد ناہید کو دیکھا تھا، اس لیے شاید میں اس کے بڑھتے ہوئے وزن سے کچھ الجھن محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا محیوب کے روپ بدل لینے سے ہماری محبت کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے؟ یا پھر حسن پرستوں کا شیوہ میری کمری خزل اور خیام کی رباعی کو کسی سراپے میں ڈھلنے ہوئے دیکھنا ہوتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں مگن چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا۔ ناہید سر جھکائے میرے قریب ہی کھڑی تھی، اس نے میں اچانک صحن کا دروازہ کھلا اور گرد اور دھول میں اٹا ایک تھکا ہارا شخص اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں کی نظر ملی۔ ناہید کو میرے قریب کھڑے دیکھ کر اس شخص کے سامنے چرتیور سی یاں پڑ گئیں۔ ناہید بھی کچھ گھبراہٹ سی گئی اور جلدی سے اس کی جانب بڑھی ”ارے ماجد... تم آئے... دیکھو بڑی زاد صاحب ہمارے گھر آئے ہیں۔ پچھتاہیں تم نے انہیں۔“ ماجد نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)



بہم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، فنک کے معروف و مشہور ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدر رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گمازی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہنا ہے، جسے اک کم صورتی کے سبب اس ظاہر پسند و زبردست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بدحیثیت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز محنت نہو لیے گا۔ ہمارا پکا دلی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماجد شہید غصے کے عالم میں ناہید کو گھور رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے اسے سرگوشی میں کچھ کہا، تو اس بار ماجد میری طرف متوجہ ہوا اور پھر اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اے پری زاد! تم..... میرا مطلب ہے آپ پری زاد ہی ہونا..... معاف کرنا، میں تجھ کی وجہ سے بچپان نہیں سکا۔“ شاید ماجد بھی میرے قیمتی اعلیٰ لباس اور باہر کھڑی نئی گاڑی سے مرعوب ہو کر فوراً تم سے آپ پر آگیا تھا۔ انسان نے مرعوبیت کے لیے کتنی ناپائیدار اشیاء کو بیاندہ بنا رکھا ہے۔ میں نے گہری نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وقت کی دھول شاید کچھ زیادہ ہی چیز سے تہ جھاری تھی۔ بہت تھکا مدامد و سا نظر آ رہا تھا۔ کبھی یہی ماجد ہم سب محلے کے لڑکوں کے لیے رشک کا باعث ہوا کرتا تھا اور میں تو خود کلاس پر رشک کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس ہستی کا محبوب تھا، جس کی پلک کا ایک اشارہ مجھے غر بھر کے لیے خاکستر کر گیا..... اور آج اتنے برسوں بعد وہ شعلہ جوالہ، میرے سامنے راکھ بنی کھڑی تھی اور اس کا وہ گل فام، غم دوروں کے پیچھے میں سب کچھ بھولا دکھائی دیتا تھا۔ کون خوش ہے بھلا اس ناشائستہ زمانے میں؟ جنہوں نے پایا، انہوں نے پا کر مٹی کرو یا اور جو پا نہیں سکے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے خاک ہوئے، مجھ سے زیادہ دیروہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ میں نے آتے وقت اپنا کارڈ ماجد کو دے دیا کہ وہ اگلے روز میرے ایک فیکٹری منیجر سے مل لے۔ میں اپنی گاڑی میں جب گلی سے باہر نکل رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرین میں ناہید کو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے جاتے وقت کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر میں کیا بات کرتا اس سے؟ وہی معذرتیں، وہی ”میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا“، ”میں آپ کا دل نہیں ڈکھانا چاہتی تھی“ ”آپ دل کے بہت اچھے ہیں.....“ وغیرہ وغیرہ، کتنا مصنوعی لگتا ہے یہ سب کچھ۔ کچھ معذرتیں اور وضاحتیں تو نہ انے گاؤ ممدل کرنے کے بجائے زخموں کا سینہ مزید کھول دیتی ہیں۔ میں بھی اپنے لیے کھلے زخم لیے گھرواپس پہنچا، تو رات وصل رہی تھی۔ کمالی نہ جانے کب سے سوسنگ پُل کے پاس کچھ فاکٹر گود میں لیے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ضروری کاغذات پر دھنچکا کر کے فاکٹر اُسے واپس کیں ”صبح لے آتے کمالی، زندگی کو اتنا جو جمل کیوں کر رکھا ہے تم نے، جب تک میرے ساتھ کام کر رہے ہو، نفع نقصان ذہن سے نکال کر کام کیا کرو۔ میں نے تجھیں اُس دن بھی بتایا تھا کہ میرے نقصانات اور فوائد کا پتہ نہ پتہ ہے۔ میں زندگی میں اتنی بار ہار چکا ہوں کہ اب جیت مجھے کسی بھی ہار سے کہیں زیادہ آداس اور پریشان کر دیتی ہے، کل ٹینڈر ٹھہر دینا، باقی اللہ مالک ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو“۔ کمالی سر نہ کھائے کھڑا رہا۔ ”مجھے آپ کو، کچھ اور بھی بتانا تھا سر..... آج صبح میں نے سینٹر رحمان کا دیا ہوا چیک واپس کر دیا ہے۔ آپ کے ایک بیلے نے مجھے عزت نفس کا وہ سبق سکھایا ہے کہ اب کبھی میرے قدم نہیں ڈگسکیں گے۔ آپ بھی میری اس خطا کو آخری سمجھ کر معاف کر دیں۔“ میں نے اس کا کاندھا چھتھپایا۔ ”بھول جاؤ کمالی، زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہونہو، یہ بھول جانے کی نعمت ہونا بہت ضروری ہے۔“ کمالی پلٹ کر جانے لگا، تو میں اچانک اس سے پوچھ بیٹھا۔ ”کمالی! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟“ کمالی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”ہاں سر! بڑا دردناک عشق چلا تھا تو جوانی میں اپنا، مگر انجام بہت بُرا ہوا آخر کار“۔ میں نے گھبرا کے پوچھا ”کیوں..... کیا ہوا تھا؟“ کمالی نے لمبی سی سانس بھری۔ ”ہونا کیا تھا سر جی، شادی ہوگئی میری اُس کے ساتھ، آج وہ میرے چار بچوں کی ماں ہے۔ سارا عشق بھاپ بن کے اُڑ گیا، مگر یوں روزمرہ فرحوں، بچوں کی فرمائشوں اور فیصوں نے کمر توڑ کے رکھ دی۔ ساری محبت ہوا ہوگئی“۔ کمالی اپنے دکھنے سنار کھلا گیا اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نادان انسان ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ محبت کو پالینا بڑا حادثہ ہے یا اس کا کھو جانا بڑا سانحہ؟ کیا شے ہے یہ محبت، ہم بھلا ہوں یا غیر بھلا، یہ محبت ہر تیک ہمارے اس پاس کن سوئیاں لیتی، ہماری سرگوشیاں سنتی رہتی ہے تاکہ ہمارے خلاف پھر کوئی پھر پور سازش نہ چا سکے۔ میری یہ تحسن پرستی بھی تو اُسی قسم گر کی ایک سازش تھی۔ لوگ باتیں بنانے لگے تھے کہ میرے اس پاس ٹوب صورت چہرہ کا منج اکٹھا رہتا ہے۔ دفتر میں، باہر فیلڈ کے محلے میں، دہلی کے دفاتر اور کمپنیوں میں، ہر جگہ انتخاب اگر میرے فیصلے سے ہوتا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی حسین چہرہ ہی نکلتا، چاہے پھر میرا زندگی بھر اس چہرے سے کبھی آمتا سامنا ہی نہ ہو مگر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ جس طرح ہم میں سے کچھ صفائی پسند ہوتے ہیں، کچھ نفاست پسند، کچھ کونا زک اشیاء پسند آتی ہیں اور کچھ خوشبوؤں کے دریا ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں حسن پسند تھا اور بس.....

اگلے روز مجھے سائنٹ ایریا والی فیکٹری کے منیجر نے بتایا کہ ماجد کو اس کی قابلیت کے اعتبار سے کسی دفتر میں کام پر لگادیا گیا ہے اور تن خواہ بھی معقول طے ہوگئی ہے۔ رات ایک میٹنگ سے گھر آتے آتے بہت دیر ہوگئی۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ رات کو جانے بیچانے رستے بھی کسی اجنبی کی طرح ہمارا استقبال کرتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں، دن پوشیدہ گوشوں کو اپنی روشنی سے اُجال کر اُن کی شناخت ظاہر کرتا ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے لوگوں، جگہوں، چیزوں اور چہروں کی اصل پہچان رات کے اندھیرے ہی میں ہوتی ہے۔ ذرا بیور سے میری یاد دیت کے خیال سے گاڑی کا ایف ایم ریڈ پلچا دیا۔ یہ ایف ایم ریڈ پو بھی ایک اچھا فرار ہے، بے راستوں کو گھٹھ کر کے گا۔ ایف ایم کا ڈی جے یا کمپیوٹر اگر چہ حال کھلا اور زندگی سے شناسا ہو تو ہماری تنہائی بانٹ لیتا ہے۔ اُس روز بھی وہ میزبان میری تنہائی بانٹنے کے لیے شعر و ادب کی باتیں کر رہی تھی۔ میں بے دھیانی میں بیٹھا اس کی فٹنی باتیں سن رہا تھا کہ اچانک اپنی نظم کے دو بول سن کر زور سے چونک اٹھا، میزبان کی آواز سننے میں گونج رہی تھی۔ ”جی ہاں، یہی ہے میری پسندیدہ نظم کا عنوان“ مگر کبھی تم کو مجھ سے نظرت ہو جائے..... تو ان راستوں سے نظرت مت کرنا..... جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے.....“ اُس رات کے اندھیرے میں، خود اپنی نظم اس ایف ایم کی میزبان کی زبان سے سن کر جانے کیوں میری پلکیں نم ہوئے لگیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔ ”جی سامعین! یہ تھی میرے پسندیدہ شاعر پری زاد کی وہ نظم، جو میں اکثر گنتا ہوں، مگر مجھے اُن سے ایک جگہ بھی ہے۔ میں اُسی بوٹی ورنی کی ایک جو نیو طالب ہوں، جہاں پری زاد نے دوران تعلیم کچھ نظمیں، غزلیں لکھیں، مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اگر خوش قسمتی سے وہ یا ان کا کوئی جانشین والا اس وقت میرا پروگرام سن رہے ہوں، تو ان سے میری اور اس پروگرام کے ہزاروں سامعین کی بس یہی ایک چوٹی سی خواہش ہے کہ وہ انھوں سے اپنا تازہ ترین۔ اب آپ سے آپ کی میزبان

قراۃ العین بخاری اجازت چاہتی ہے۔ کھل پھراتا گیا وہ بیچے آپ کے پسندیدہ پروگرام ”بزمِ ادب“ کے ساتھ حاضر ہوں گے، جب تک کے لیے اپنا بہت سا خیال رکھیے، شب بخیر۔“ میں پروگرام سننے میں اس قدر مگن تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ہم کب گھر پہنچ گئے۔ رات بھی بستر پر کروٹیں بدلتے، اُن گت سوچوں میں گزری۔ مجھے اپنے ایک اردو کے استاد کی بات ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ لفظ اپنے خالق کا ہمیشہ چھپا کرتے ہیں۔ اُس کی پہچان بن کر ہمیشہ کے لیے وقت کی کسی لہر میں امر ہو جاتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میری نوٹی پھوٹی شاعری اور بے بسی کے عالم میں کبھی چند نظمیں میری یونیورسٹی کے سالانہ رسالے میں بچھ کر یوں امر ہو جائیں گی کہ اتنے برسوں بعد بھی میری شناخت پائی رہیں گی۔

اگلے روز دفتر پہنچا تو یونیورسٹی سے احمد صاحب پہلے ہی آئے بیٹھے تھے اور کافی تھا بھی تھے، کیوں کہ میں کسی نہ کسی بہانے ان کی تمام تقریبات کے دعوت نامے ملاتا آتا تھا۔ مگر اس روز ان کے تہہ بہ تہہ تھے کہ وہ مجھ سے کوئی وعدہ لے کر ہی انھیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلی شام یونیورسٹی کی بزمِ ادب کی سالانہ انعامات کی تقریب تھی اور وہ پہلے ہی زبردستی کارڈ پر میرا نام بھی مہمان خصوصی کے طور پر درج کر دے گئے تھے۔ میں نہ نہی کرنا رہ گیا، لیکن وہ ممکن دے گئے کہ اگر اس بار بھی میں نے تقریب میں شرکت نہ کی، تو وہ آئندہ کبھی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ اب میں انہیں کیسے مانتا کہ اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر بیٹھنے اور ان کے سامنے کچھ بولنے کے خیال ہی سے میرے پسینے پھوٹنے لگتے ہیں۔ وہی چھپتی نظریں، جو مجھے اپنے آ رہا ہوتی محسوس ہوتی ہیں، وہی دلی دلی سرگوشیاں، طنز و مسکرائشیں، کاش احمد صاحب میرے اس دل ناکارہ کی حالت سمجھ سکتے مگر یہ ہونہ کار اور اگلے روز ٹھیک شام 5 بجے اسٹیج کے ڈاکس پر میرا نام لکھا گیا تو میں نظریں اُٹھ کھانے ٹائیک کے سامنے کھڑا ہوا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہال میں قماشائیوں کی جانب روشنی ملتی ہی تھی، اسی لیے مجھے طلبہ کے چہرے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے اور ویسے بھی اسٹیج کا فاصلہ پہلی روکی کرسیوں سے کافی زیادہ تھا، اپنی سانس درست کرنے میں مجھے چند لمحوں کا وقفہ مل گیا۔ میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگی۔ طلبہ اور دیگر عملہ انہماک سے میری بات سن رہا تھا۔ ”میں کوئی شاعر، مقرر یا لیدر نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔ بس، کچھ مہربانوں کی محبت مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے اور میری اس درس گاہ کا مجھ پر جوش ہے، وہ مجھے ہمیشہ اس چار دیواری سے جوڑے رکھتا ہے۔ میں احمد صاحب اور ان تمام اساتذہ کا کھڑکڑا ہوں، جنہوں نے سالانہ شمارے میں میرا تعارف اور چند اپنی نظمیں شامل کر کے، میرے کچھ بوسیدہ اشعار کو زندہ رکھا۔ یہ اشعار دراصل اشعار نہیں، میرے دل کی نثر ہیں۔ میری اپنے آپ سے کی گئی کچھ باتیں ہیں، جو کبھی صفحات پر آگئیں تو آپ لوگوں سے بابت لیں۔ آپ لوگ اسے شاعری سمجھتے ہیں تو یہ آپ کا حسن ظن اور ظرف ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔“ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹنے لگا تو درواکھتار میں بیٹھی، سیاہ چشمہ لگائے ایک تھلی سی لڑکی کھڑی ہو گئی اور ناظرین کے لیے رکھا ہوا ٹائیک ہاتھ میں لے کر بولی۔ ”سر! میرا قراۃ العین ہے۔ میں اسی یونیورسٹی میں فائل ایڈیٹر طالبہ ہوں اور رات گئے ایف ایم ریڈیو پر ”بزمِ ادب“ کے نام سے ایک پروگرام بھی کرتی ہوں۔ میرے سننے والوں کی ایک بڑی تعداد آپ کی شاعری میرے پروگرام کے توسط سے پہنچی ہے اور وہ سب آپ سے مزید کچھ نیا سننے کی خواہش رکھتے ہیں، مگر آپ نے یونیورسٹی کے بعد ذوق کچھ کہا ہی نہیں۔ کیا ہم امید رکھیں کہ آپ پھر سے اپنا نانا حروف سے جوڑنے کی کوشش کریں گے؟“ میں نے مختصر جواب دیا۔ ”جی ضرور۔۔۔۔۔۔ اگر غم و دواں نے کچھ مہلت دی تو۔۔۔۔۔۔“

ابھی اک رات قبل ہی میں نے اس لڑکی کا پروگرام سنا تھا اور آج اس سے ملاقات بھی ہو گئی، کبھی کبھی وقت کی چالیں بھی کتنی عجیبی تلی ہوتی ہیں۔ تقدیر اپنا اسکرپٹ کیسے دھمے انداز میں لکھنا شروع کرتی ہے، ہم معصوم انسانوں کو قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ مقدور کا یہ مسودہ آگے چل کر ہم پر کیسی قیامتیں ڈھانے والا ہے۔ میں بھی آنے والے محشر سے بے خبر تقریب کے خاتمے کے بعد گھر روانہ ہوا تو کمائی سے رہا نہیں گیا۔ ”سر! آپ نے کبھی بتایا نہیں، آپ تو بہت مشہور شاعر ہیں۔ ساری یونیورسٹی آپ کے لیے ہال میں جمع تھی۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”یہ خود میرے لیے بھی ایک خبر ہے، اتنے برسوں بعد بھی میرے حرف میری شناخت ہیں۔ مجھے خود بھی حیرت ہے۔“ اس میں حیرت کی کیا بات ہے سُر جی۔۔۔۔۔۔ یہ آج کل کی نوجوان نسل ان چیزوں میں بڑی دل چسپی رکھتی ہے۔ ایف ایم، انٹرنیٹ اور حتیٰ کہ سیل فون پر بھی ہر ذمہ ان چیزوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ میر، دور، غالب اور اقبال کو بھی ہم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں سر۔ بظاہر بڑی لالہ لالی ہے یہ نئی نسل، مگر اپنے مطلب کی چیز پر جتنی اور شغفی ہے۔ چاہے کتاب کے ذریعے یا کسی اور طرح۔۔۔۔۔۔ میں چپ رہا۔ ”ارے ہاں یاد آیا، وہ ایف ایم کی ڈی جے لڑکی نے آپ کا سیل نمبر مانگا تھا، رات کو اپنے پروگرام میں آپ کو براہ راست شرکت کی دعوت دینا چاہتی تھی، میں نے آپ سے پوچھنے بجائے نمبر تو دے دیا ہے، مگر خاص تاکید کی ہے کہ پہلے آپ سے خود بات کر کے اجازت طلب کر لے۔“ اور پھر رات گئے میرے موبائل فون پر ایک اجنبی نمبر جگانے لگا۔ تیسری کال پر مجبوراً مجھے فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف وہی تھی۔ ”معاف کیجیے گا سر! شاید آپ کے پیچھے نے آپ کو میری درخواست نہیں پہنچائی۔ میں ڈی جے یعنی ہوں۔ میں اپنے پروگرام میں آپ کو لائیو کال پر مدعو کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ ہم آپ کے صرف دس منٹ لیں گے، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے کچھ لمحوں وقف کیا۔ ”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ۔۔۔۔۔۔؟“ وہ مومنیت سے بولی۔ ”کچھ عام سے سوال، آپ کی زندگی کے بارے میں، آپ کی کامیابیوں کے بارے میں، آپ کی ادب و ادبی کے بارے میں۔ سنا ہے، شہر کی سبھی بڑی ادبی تقریبات اور مستقبل کے منصوبوں میں آپ کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے سامعین تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ آپ کی ترقی کا راز جاننا چاہتی ہوں، عام طور پر ادب سے جوئے لوگوں کو یہ معاشرہ بادی ترقی سے بہت دور سمجھتا ہے۔ یہ ادیب، شاعر عموماً مظلوم الحال دکھائی دیتے ہیں، مگر آپ نے صرف خیالی نہیں، حقیقی دنیا کو بھی فتح کر دکھایا ہے۔ میں یہ سب باتیں جانتا چاہتی ہوں۔“ میں اس کی باتیں سن کر انجینے میں پڑ گیا۔ ”مگر آپ کو میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے پتا ہے؟“ وہ ہنس پڑی۔ جیسے بہت دور کسی مندر میں ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بچا آگئی ہوں۔ ”احمد سر نے بتایا، اور پھر میرے ریڈیو پروگرام کی وجہ سے شہر کی تقریباً سبھی بڑی ادبی ہستیوں کے ساتھ ملاقات رہتی ہے میری۔ سبھی سے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سننے کو ملتا ہے۔ سچ کہوں تو لوگ بہت متعجب رہتے ہیں آپ کے بارے میں۔۔۔۔۔۔“ وہ اپنی دھن کی پیکل لگتی تھی۔ میرے لاکھٹا لٹنے کے باوجود، مجھ سے اپنے اگلے روز کے پروگرام کے لیے کچھ منٹ لینے میں کامیاب ہوئی گئی اور میں اگلے دن تمام وقت اسی الجھن میں جھلا رہا کہ رات، اس کے ساتھ کیا بات کروں گا؟ میں نے تو بہت زمانہ پہلے خود سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ شام تک یہ الجھن اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ میں نے اپنے پی اے کو یعنی کا دینی فون نمبر ملانے کو کہا، جو گزشتہ رات میرے موبائل فون پر جنگلگا تھا۔ پی اے نے کال ملا کر میری طرف ٹرانسفر کی، تو دوسری جانب سے اس کی بے یقین اور کھٹکھٹاتی سی آواز سنائی دی۔ ”ارے سر! آپ۔۔۔۔۔۔؟ کتنا حسین اتفاق ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ نے مجھ کو کال کی ہے، میں ابھی رات کے پروگرام کی تیاری ہی کر رہی تھی۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”آپ سے ایک درخواست کرنی ہے، کیا ہم گزشتہ رات کیسے ہوئے معاہدے کو کچھ دن کے لیے آگے بڑھا سکتے ہیں، اگر ممکن ہو تو؟“ ”جی سر، کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔ مگر کوئی خاص وجہ۔۔۔۔۔۔؟“ ”پتا نہیں، وجہ شاید خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ دراصل میں بہت الجھن ہی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا کبھی پسند نہیں رہا، آپ کچھ دقت دیں گی تو شاید میں خود کو تیار کر پاؤں، ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔“ دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ ”ٹھیک ہے

سُرا جیسے آپ کو مناسب لگے، مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ آپ نے پروگرام سے کافی دیر پہلے خود فون کر کے معذرت کرنی، ورنہ عام طور پر بڑے لوگ ہمیں اطلاع دینا بھی پسند نہیں کرتے، اپنی کسی غیر حاضری کی۔ مگر آپ کو یہ وعدہ تو بہر حال کرنا پڑا ہے گا کہ آپ جب بھی خود کو جتنی طور پر تیار کر پائے تو یہ معاہدہ پورا ضرور کریں گے۔ میں ہنس پڑا، ”ہاں، چلیں وعدہ نبھانے کا ایک اور وعدہ سہی۔ میری مشکل سمجھنے کا شعر یہ۔“ میں نے فون کاٹ دیا، مگر کہیں ڈور کوئی دوسری لائن جوڑ رہی تھی۔ میرا نادان دل سب کچھ جاننے بوجھتے ہوئے بھی، ہر نتیجے سے بے خبر پھر سے دھڑکنا چاہتا تھا اور میں بڑی سختی اور بے رحمی سے اسے صرف ایک ہی بات ساری رات سمجھاتا رہا کہ کچھ دلوں کا مقدر صرف بھڑکی گنتی پوری کرنا ہوتا ہے۔ وہ کچھ اور قلب ہوتے ہوں گے کہ جن کی تقدیر میں دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ بڑے نادان ہیں وہ لوگ، جو اپنے دل کے ایک فرض کو دھڑکنے سے تشبیہ دے پھرتے ہیں۔ مگر یہ دل بھلا کب کسی کی سنتے ہیں۔ مندر، روز، آزاد، وحشی اور جنگلی گھوڑے بھلا کس لگام کے قابو آتے ہیں۔ میرا دل بھی بے لگام ہونے کو آیا تھا۔

اگلے روز نہ چاہتے ہوئے بھی میں سارا دن اس کے فون کا انتظار کرتا رہا اور پھر شام ڈھلے، جب تھک ہار کر میرا بے چین سن اپنی بے وقوفی پر ہنسنے لگا کچھ آرام پانے کو تھا، ابھی اچانک اس کا فون آگیا۔ قسمت کی آنکھ چھوئی، وقت کا انتخاب خوب خن کر رہی ہے اور پھر ان ٹیلی فون کا لڑکا دورانیہ اور تعداد براہی گئی۔ ہم بہت عام سی باتیں کرتے تھے۔ وہ بھری مصروفیت کی، شام کی چائے کی، رات کی چٹل قدمی کی، مگر یہ باتیں میرے لیے کتنی خاص تھیں، یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ اُس دن یونیورسٹی کی تقریب والی ملاقات کے بعد میری آج تک دوبارہ کبھی یقینی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، نہ ہی میں نے دوبارہ کبھی اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار ہی کیا تھا۔ یہ ٹیلی فون کی آدھی ملاقات میرے لیے کسی بھی بالمشافہ ملاقات سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں دوبارہ یقینی کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ہال میں مجھے کافی فاصلے سے اور ٹکجے اندر صبر سے دیکھا، میں اپنے اور اس کے درمیان یہ اندھیرا ہمیشہ حائل رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دن اور روشنی میں اس سے ملنے کی تمنا ہی بھلا کب تھی۔ میرا بس چلتا تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے دن کے بارہ گھنٹوں کی روشنی بھی کشید کر لے، کیوں کہ مجھے اُنچالے کبھی راس نہیں آتے تھے۔

اگلے روز میرے اسٹاف نے خوب صورت جھانوی کاغذ میں بیک شدہ ایک پارسل میری میز پر رکھ دیا۔ بیچنے والے پتے میں قراۃ العین بخاری کا نام درج تھا۔ میں نے سب کے جانے کے بعد احتیاط سے کاغذ کی پرتیں کھولیں۔ اندر سے ایک خوب صورت سامناشی مجسمہ برآمد ہوا، جسے کمرے میں کہیں بھی شوہیں کے طور پر رکھا جاسکتا تھا۔ میں نے جلدی سے عینی کا نمبر لہرایا۔ دوسری جانب سے اس کی کھٹکتی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں جانتی تھی سُر! آپ کا فون آتا ہی ہوگا، کیسے کیسا لگا تھو؟“ ”بہت اچھا۔۔۔۔۔۔ مگر موقع کل سمجھ نہیں سکا، میں اس ختے کا۔ آپ نے تکلف کیا تھی۔۔۔۔۔۔“ وہ ہنسی۔ ”ارے نہیں سُر! بالکل بھی تکلف نہیں ہے۔ یہ میرا مشغلہ ہے۔ فارغ وقت میں، نہیں مٹی اور پلاسٹک ہیرے مجھے بناتی ہوں۔ میری اپنی ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری ہے، میرے گھر کے اندر، بس وہیں یہ مشق جاری رہتی ہے۔ کبھی آپ بھی آئیے ناں وقت نکال کر، میں آپ کو اپنا کام دکھاؤں گی۔“ میں بولتے بولتے انک سامگیا۔ ”ہاں کیوں نہیں، مگر آپ اور کیا کچھ کرتی ہیں، ایک ہی بار اپنے سارے منہ بتا دیں۔ کبھی کبھی حیرت درحیرت بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے دوستوں کے لیے۔۔۔۔۔۔“ میری بات سن کر وہ شرمایا گئی۔ ”نہیں نہیں، مجھ میں بھلا کیا منہ ہوگا۔ بس وقت کاٹنے کے بہانے تلاش کرتی ہوں۔“ بات آگئی گئی ہو گئی۔ مگر میرا ہمولا من اس لڑکی کے منہ کا شکار ہوتا گیا۔ دل موہ لینا بھی تو ایک منہ ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا منہ۔ اور میں اس کی اس کاری گری سے خود کو بچا نہیں پارہا تھا۔ مگر پھر ایک دن ہمیشہ کی طرح بھٹی، جگڑنے لگی۔ شام ہی سے میری طبیعت عجیب بے چین اور اُداس سی تھی، مجھے ایک بار پھر اپنے آس پاس سب کچھ بنا مقصد اور بے فائدہ دکھائی دے رہا تھا۔ دل کوچپ سی لگی ہوئی تھی کہ اچانک عینی کا فون آگیا۔ ”کہاں غائب رہے ہیں سُر آپ، بہت دنوں سے آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں، مگر آپ کی مصروفیت کا خیال آؤں آجاتا ہے۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”میری مصروفیت بس ایک فرار ہے، آپ کہیں، کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ وہ کچھ دیر چپ رہی۔ ”دراصل میں آپ کا ایک مجسمہ بنانا چاہتی ہوں۔ پھر میں اُسے ساری دنیا کو دکھاؤں گی۔“ جانے کیوں بل بھری میں، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ مجھے لگا کہ ساری دنیا کی طرح وہ لڑکی بھی آج میرا مذاق اڑانے کے موڈ میں ہے۔ اس نے مجھے دُور سے ہی سہی، مگر دیکھ تو رکھا تھا۔ ضرور اس نے در پردہ میرے چہرے کی تضحیک کا یہ طریقہ نکالا ہے۔ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔ ”مجھے خوب صورت چہروں کے بنائے جاتے ہیں مس عینی۔۔۔۔۔۔ اور میں؟ بہر حال، مجھے آپ سے اس مذاق کی امید ہرگز نہیں تھی۔ آپ بھی دوسروں کی طرح ہی لگیں۔“ میں نے فون بٹخ دیا۔ وہ ہیلو بولو کر رہی گئی، مگر میں نے اگلے پورے تینتے اس سے بات نہیں کی۔ دفتر کے نمبر پر فون آیا بھی، تو اسٹاف سے کہہ دیا کہ مصروفیت کا بہانہ کر دے۔ اس نے کچھ خطا بھی سمجھے، مگر میں نے پڑے بنا ایک طرف رکھ دیے اور پھر آٹھویں دن وہ خود میرے دفتر آگئی۔ میں آفس میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی سیاہ چشمہ اس کے گودے چہرے پر پہرہ جمائے بیٹھا تھا۔ دو بولی، تو اس کی آواز رندہ سی گئی، جیسے وہ بہت دیر روتی رہی ہو۔ ”آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ میں جھلا اٹھا۔ ”آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ میری صورت کا مذاق ہی اڑاتا تھا تو کوئی اور طریقہ اپنا لیتیں، مگر یہ مجسمہ۔۔۔۔۔۔“ وہ رو پڑی۔ ”میں آپ کا مذاق اڑانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی، بہت عزت کرتی ہوں میں آپ کی۔“ آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میں نے تو بنا دیکھے ہی آپ کا ایک مجسمہ اپنے من میں بنا رکھا ہے۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ اس نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتارا۔ ”میں دیکھ نہیں سکتی۔۔۔۔۔۔“ ایک زوردار جھماکا سا ہوا اور میرے ارد گرد تمام کمرے میں اس کی بے نور آنکھوں کا اندھیرا پھیل چلا گیا۔

(جاری ہے)

دولہ گی پڑی زادہ..... میں بہت محنت کروں گی، بہت زیادہ..... میری زندگی کی سب سے یادگار برقرار نہیں ہوگی اس ضمن میں، میرے پاس ایک کہانی ہے، اگر تمہیں پسند آگئی، تو میں راترے کہانی پر کام کرنے کا کہہ دوں گی، مگر تمہیں وقت نکالنا ہوگا اس فلم کے لیے۔ میں تمہاری موجودگی میں بہت سہارا محسوس کروں گی۔" لٹنی چلی گئی اور میں شام کو کسی معمول کی طرح بیٹنی کی گیلری پہنچ گیا۔ اسے گیلی مشنی گوندتے دیکھ کر نہ جانے مجھے ہر بار ایسا کیوں لگتا تھا، جیسے مٹی بھی اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوگی کہ کس کے ہاتھوں اس کا بُت بننے جا رہا ہے۔ اس شام ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کرتی ہیں، مگر اس کا انداز بیان کس قدر جدا تھا۔ وہ جب رنگوں، خوشبوؤں، ذہنی شاموں اور باتوں کے ظلم کا ذکر کرتی، تو میں دم بخود سا بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے میں بیٹنی کے گھر سے نکلا تو ہوا تیز چل رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے جھنڈ حیرت سے اس نے پڑی زادی کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے، راستے ہی میں چند بوندوں نے لپک کر میری گاڑی کی وڈا سکرین سے گاڑی کے اندر جھانکا اور مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے سے اشارے کرتی، بیٹنی ہوئی برستی بارش میں اپنی دوسری سہیلیوں سے جا ملیں۔ کیر خان حسب معمول چوکتا سا ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا اور گردو پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسنے میں لٹنی کا نمبر میرے سیل فون پر جگگنے لگا۔ "پڑی زادہ..... کہاں ہو تم؟" "انٹنی شہر کے انٹنی راستے..... اور میں۔" وہ فیس پڑی۔ "اسنڈو پو آسکتے ہو ابھی۔ مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔" میں نے کیر خان کو اسنڈو پو چلنے کو کہا۔ ہم ویران سے فلم اسنڈو پو کے گیٹ پر پہنچے تو چند عجیب سے چلیے والی عورتیں اور مرد ہمیں اندر گھومنے نظر آئے۔ عجیب سی آواہی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی سارے ماحول پر، جیسے کوئی سوگ برپا ہو۔ ہم ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے، تو وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ کیر کا حلیہ اور کاندھے سے لٹکا ہوا بٹل دیکھ کر وہ سب کچھ جزبے ہو گئے۔ میں نے کیر کو باہر انتظار کرنے کو کہا۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر ہی بھاگتا رہے گا۔ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ سارے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ لٹنی نے ڈائریکٹر اور باقی لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ ایک جانب کونے میں ایک بوڑھا شخص

بارمونیم سامنے رکھا بیٹھا تھا اور اس کی آڑ میں سٹائی ایک شریلی سی لڑکی، چھوٹی موٹی سی بیٹی تھی، جو اس دفتر کے ماحول سے بالکل میل نہیں کھتا رہی تھی۔ باقی لوگوں کی جیبتی ہوئی نظریں لڑکی کے جسم کے آ رہا ہوں جیبتی، مگر میرے آتے ہی ڈائریکٹر نے فالٹو محلے کو باہر بھیج دیا تو لڑکی کے جسم کا تھوڑا کچھ کم ہو گیا، مگر ابھی تک وہ وہیں دیکھی بیٹنی تھی۔ لٹنی نے مجھے بتایا کہ وہ غم رسیدہ شخص استاد بنے خان ہے، مشہور موسیقار اور اس کے پہلو میں مٹی ہوئی لڑکی سنبھل ہے، استاد بنے خان کی بیٹی اور آج وہ دونوں لٹنی کی آنے والی فلم کی ڈھونڈ پر کام کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ڈائریکٹر ایک کچی عمر کا تیز طرار سا بندہ تھا، جسے فلم ملنے کی بے حد خوشی تھی، لیکن کہیں اندر سے کوئی بے یقینی بھی اسے کھائے جا رہی تھی۔ "بس پڑی زادہ صاحب! کیا بتاؤں آپ کو، کبھی یہی فلم اسنڈو پو تھا کہ چوبیس گھنٹے کام کی شفٹ چلتی رہتی تھی، کہیں اندیم صاحب، تو کہیں مٹھی صاحب۔ کہیں شاد تو کہیں وحید مراد کوئی نہ کوئی شوٹنگ جاری رہتی تھی۔ یہ جو فوراً آپ نے نیچے دیکھا ہے ناں، یہاں تو بیک وقت تین تین گانے شوٹ ہوا کرتے تھے۔ بس پھر نہ جانے کیا ہوا، سب برباد ہوتا چلا گیا۔ اب تو سال بھر میں ایک آدھ فلم بنتی ہے، اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ سیکڑوں کاری گرا اور ان کے خاندان بے روزگار ہو گئے۔" وہ مزید بتاؤ کے پوچھتی بولتا رہتا، اگر لٹنی اسے اشارہ کر کے روک نہ دیتی۔ لٹنی ہی کے کہنے پر ڈائریکٹر نے مجھے فلم کی کہانی سنائی، بنیادی پلاٹ محبت کی کہانی پر مرکوز تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین یا چار کہانیاں ہی پائی جاتی ہیں۔ باقی ساری کہانیاں انہی کہانیوں سے جنم لیتی ہیں اور مجھے یہ پڑھ کر ڈرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی، تین چار کی جگہ اگر صرف ایک محبت کی کہانی ہوتی، تو بھی اس کا نکات کے لیے کافی تھی۔ درمیان میں ڈائریکٹر ہمیں گانے کی بیجو تھی اور مقام بھی بتاتا رہا اور کہانی کے اختتام کے بعد استاد بنے خان اپنا بارمونیم اٹھائے کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے۔ سنبھل بھی استاد کے ساتھ سٹ کر بیٹھ گئی اور استاد نے راگ جھیر دیا۔ لڑکی کی آواز واقعی ٹریٹی تھی اور گلے میں بنا کا کوچ تھا۔ دو گانے کے دو بول دہرائی اور پھر گھبرا کر میری طرف اپنی ہرٹی جیبتی آنکھیں اٹھا کر دیکھتی کہ میں دل جیبتی لے رہا ہوں یا نہیں۔ فون کو ہمیشہ سناس کی تمنا رہتی ہے اور شاید فون کا راکو اپنے قدر دانوں کی نظریں پڑھنے کا فانی آتا ہے۔ "جب بارش کی پہلی بوند گرے..... تم چلے آنا..... میرا سندرہ ملے نہ ملے..... تم چلے آنا....." باہر برستی بارش کے جلتیگ کے ساتھ مل کر استاد بنے خان کے سر اور سنبھل کی ریلی آواز ایک عجیب سا ماحول پیدا کر رہے تھے۔ استاد نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹی نے بی۔ اے کر لیا ہے، مگر اب وہ اپنے آبائی فن سے متعارف کروانا چاہتا ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ شہ پارہ تنگم نے انہیں اپنی ہی فلم میں موقع دینے کا وعدہ کیا ہے، مگر یہ میری منظوری پر منحصر ہے۔ استاد کسر نفسی کا پیکر تھا اور اس کی اور بیٹی کی خستہ حالی، ان دونوں کی حالت بھی پوری طرح بیان کر رہی تھی۔ مجھے وہ ایک وضع دار شخص لگا، جسے بھینا کسی بہت بڑی مجبوری نے ہوں بیٹی کو فلم انڈسٹری کے ماحول میں بطور گلوکارہ متعارف کروانے پر اکسا یا ہوگا۔ جب استاد نے لاجت سے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے ان باپ بیٹی کا فانی پسند آیا تو میرے لب کپکپائے گئے۔ "یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے سنا بھی نہیں آتا۔ میں بھلا آپ کے فانی کی جانچ کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ کی ریاضت اور محنت نے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ کوئی ہنرمند ہی آپ کو صحیح داد دے سکتا ہے۔" استاد نے کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ لٹنی نے موضوع بدل دیا۔ "آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئے ماسٹری..... پڑی زادہ صاحب کی یہ پہلی فلم ہے۔" استاد بنے نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا "ہاں، پر ادب والے ہیں۔ شاید اسی لیے آج اس مقام پر ہیں۔" میں نے لٹنی سے دبے لفظوں میں دوبارہ کہا کہ وہ فلم سے متعلق تمام فیصلوں کی حقارت ہے۔ مجھے ان کھچڑوں سے دور رہی رکھے، مگر وہ نہیں مانی اور اگلی رات کے لیے پھر سے فلم کی دوسری بیٹنگ رکھ دی گئی۔ ہم لوگ چائے پی کر رخصت ہوئے تو گیٹ کے قریب میں نے استاد بنے اور سنبھل کو سڑک کنارے انتظار کرتے دیکھا۔ میں نے شیشہ نیچے کر کے پوچھا تو پتا چلا کہ سڑک کے بائیس کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ان کے لاکھ انکار کے باوجود میں نے انہیں گاڑی میں بٹھالیا۔ بارش تیز تر ہو چکی تھی۔ ہماری گاڑی اندرون شہر کی چند تاریک گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک پرانے محلے کے بوسیدہ سے مکڑی کے پھانک نما گیٹ پر جا کھڑی ہوئی۔ استاد نے بہت اصرار کیا کہ میں ایک کپ چائے پی کر جاؤں، مگر میں نے معذرت کر لی۔ اس کی بیٹی نے بھی دبے لفظوں میں مجھے گھر آنے کا کہا۔ میں نے پھر کسی آنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ دونوں ہماری گاڑی نکلے تک وہیں کھڑے رہے۔

اگلی شام میں ٹھیک چار بجے بیٹنی کی گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا، جیسے ایک پڑھا کوچ ٹھیک وقت پر اپنی جماعت میں پہنچ کر سبق سنانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ میں نے بیٹنی کو فلم کے بارے میں بتایا تو خوشی سے چلائی۔ "فلم..... واہ..... پڑی زادہ میں آپ کی فلم کی آرٹ ڈائریکٹر ہوں گی۔ ساری سجاوٹ میری طے کردہ ہوگی، برسیٹ پر میری بنائی ہوئی صورتیں ہوں گی، ٹھیک.....؟" "ہاں ہاں، ٹھیک ہے، مگر پہلے میرا مجسمہ تو مکمل کر دو۔ کہیں اس فلم کے چھپیلے میں ہمارا کام ہی نہ رہ جائے۔" وہ میری بات سن کر زور سے فیس پڑی۔ سنا نے میں ایک لخت بہت سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ میں بحر زدہ سا بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ زندگی بس اسی دورانیے کا نام ہوتی، تو نکلتا اچھا ہوتا، مگر ہر اچھے وقت کی طرح یہ پل بھی پل بھر میں کٹ گئے اور مجھے احسا پڑا۔ واپسی پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی اسنڈو پو کی طرف موڑنے کا کہا تو کیر اپنے چہرے کے تاثرات چھپا نہیں پایا۔ "صاحب! اجازت دو تو ایک بات

بولے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہاں بولو۔۔۔۔۔؟“ وہ اگلی سیٹ پر اپنی جگہ بیٹھے ذرا سا کسمسا ”صاف“ ایسے اسٹوڈیو کا علاقہ محض غائب ہے۔ ہزار دوست، ہزار دشمن ہوتا ہے بندے کا۔۔۔۔۔“ میں نے چونک کر کیر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اپنی زبان کھولتا تھا، جب اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے شہر میں بہت سوں کی ترقی رک چکی تھی۔ ہر بڑا نیند ز میرے نام کھل رہا تھا۔ میری دولت کا شعلہ میں اپنے جوبن پر تھا، جو مایا کا کوئی بھی ذرہ اپنے سے دور جانے نہیں دیتا تھا اور یقیناً یہ بات بہت سوں کو کھلچکی ہوگی۔ گاڑی اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی تو حسب معمول چند آوارہ دوشوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈائریکٹر کے کمرے میں نشست جمی ہوئی تھی۔ استاد نے اور سنبل نے تیار کردہ ڈھنوں پر کچھ گیت گنگائے۔ مگر مجھے شاعری کچھ عامیانت لگی۔ لٹنی نے میری بے چینی بھانپ لی۔ ”ہڈی زاو۔۔۔۔۔ تم خود کیوں گیت نہیں لکھتے اپنی فلم کے لیے۔“ سنبل نے شاعری کے ذکر پر چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے

جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں نہیں، مجھے فلمی شاعری کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم کسی مستند فلمی شاعر سے گیت لکھوا لیں۔“ سنبل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور جھجک کر بولی۔ ”اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہمارے محلے میں ہی ایک بہت اچھے شاعر رہتے ہیں۔ وہ دنیا داری سے نا نا نہیں، مگر ضرورت مند بھی ہیں، ہو سکے تو۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے پُپ ہو گئی۔ ڈائریکٹر نے منہ بنایا ”دیکھ لیں گے اُسے بھی، کون سا ساحر لدھیانوی یا مجروح سلطان پوری ٹھپا بیٹھا ہے اس کے اندر؟“ لٹنی شاعری میں دیر کی وجہ سے کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بنے خان سے کہا کہ ہم ابھی چل کر مل لینے ہیں اس شاعر سے۔ ڈائریکٹر بولکھلا سا گیا۔ ”ارے کیا بات کرتے ہیں سر می۔۔۔۔۔ آپ کیوں جانیں گے، وہ خود آئے گا یہاں۔“ میں نے اس کی سُنی آئی سُنی کر دی۔ ہم اسٹوڈیو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک چند لوگ ”شاہ جی۔۔۔۔۔ شاہ جی“ کہتے ہوئے ایک خوش لباس شخص کی طرف لپکے، استاد نے اُسے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ شخص بہت گرم جوش اور عزت سے بنے خان سے ملا۔ گاڑی آگے بڑھی، تو بنے خان نے مجھے بتایا۔ ”یہ سید نور صاحب ہیں۔۔۔۔۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری اب بس انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ آج کل بڑی اچھی فلم بن رہے ہیں، بھانجن۔“ گاڑی بنے خان کے اندر چلے گئے۔ سنبل اور بنے خان کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے بٹی کے ساتھ بیچہ اتر آیا۔ چند گلیاں گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹے سے کچے مکان کے آگے ٹک گئے۔ دستک کے جواب میں اندر سے کسی نے لرزتی آواز میں کہا ”اندر آجائے صاحب، مزاروں کے دروازوں پر دستک نہیں دی جاتی۔“ میں، سنبل اور بنے خان کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے برآمدے کے سامنے بنے واحد کمرے کے اندر لائٹن کی کم زوری روشنی نے ٹیالا اُجالا پھیلا رکھا تھا۔ بنے اور سنبل کو دیکھ کر میزبان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی ”کبھی ہم خود کو کبھی گھر کو دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔“ بان کی جھلک سی چار پائی پر لیٹا وہ کم زور سا نوجوان اٹھ بیٹھا۔ ”معاف کیجیے گا، کمرے میں ایک ہی کرسی ہے لہذا۔۔۔۔۔“ وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا، مگر میری نظریں اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی میری چھتی نظریں محسوس کر کے میری جانب متوجہ ہو گیا۔ اور پھر اس کی حالت بھی مجھ جیسی ہی ہو گئی اور وہ بے تابی سے کھڑا ہو گیا اور لپک کر مجھے شانے سے پکڑ کر سرسراتی آواز میں بولا ”ہڈی زاو۔۔۔۔۔ یہ، یہ تم ہی ہونا۔۔۔۔۔“ میری آنکھیں نم ہوئے نکلیں ”کیوں؟“ یہ چہرہ دیکھ کر بھی نہیں پہچانتا کیا صرف لباس وحلیہ بدلا ہے میرا۔ مقدر وہی لیے پھر رہا ہوں نا ساز۔۔۔۔۔“ وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ کہاں چلا گیا تھا یار! اپنے دوست کو بھی بھلا دیا۔“ بنے خان اور سنبل حیرت زدہ اور پریشانی سے ہم دونوں کو گھٹل کر روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہاں وہ نا ساز ہی تھا۔ میرے کالج کے دور کا واحد دوست، جس نے میرے اندر کبھی شاعری کی چنگاری کو ہوا دے کر شعلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ سنبل نے جھجکے ہوئے نا ساز سے کہا ”آپ نہیں جانتے ہیں، یہی فلم کے پروڈیوسر ہیں ہڈی زاو۔۔۔۔۔ اور میں نے ان ہی کی فلم کے لیے نغمہ نگاری کرنے کو کہا تھا آپ سے۔“ نا ساز حیرت سے مجھے ٹوٹ ٹوٹ کر دیکھتا رہا۔ ”یہ کیا انقلاب ہے پیارے، سب فتح کر لیا کیا میرے شہسوار؟ تو تو واقعی فاتح نکلا۔“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ”نہیں۔۔۔۔۔ اب بھی ہمارے ہاں، بس سونا چاندی بیچ ہوتا جا رہا ہے زار اور کے طور پر، دل اتنا ہی دیران اور نا کارہ ہے اب تک۔“ وہ زور سے ہنسا ”یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ دصالب یار ہوتا۔“ بنے خان اور سنبل ہمیں باتوں میں مصروف دیکھ کر گھر سے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔ نا ساز کے گھر کی حالت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پاس شاید چائے کے پورے برتن بھی نہ ہوں۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ کم زور اور لاغر لگ رہا تھا۔ وہ غور سے میری داستان سن رہا۔ اس کے آس پاس رداؤں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔ ”یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے نا ساز۔۔۔۔۔ کالج کا سب سے خوش پوش اور زندہ دل لڑکائیوں بستر سے لگا پڑا ہے۔ سب خیر تو ہے نا۔۔۔۔۔“ وہ ہنسنے لگی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یاد ہے، کالج کے دور میں ہم نے ٹھپ کر بائیں میں دی سی آر پر فلم دیکھی تھی ”نمک حرام“ اس میں وہ شاعر والا گیت ہم دونوں کتنا گنگنا کر کرتے تھے۔“ میں شاعر بدنام۔۔۔۔۔ میں چلا۔ محفل سے ناکام۔۔۔۔۔ میں چلا۔ ”تو بس یار۔۔۔۔۔ یہ شاعر جو ہوتے ہیں ناں، یہ محفل سے ناکام ہی چلے جاتے ہیں۔“ میں نے اسے غور سے دیکھا ”اور یہ پھولوں جیسی لڑکی سنبل، یہ اس شاعر ناکام کی کیا لگتی ہے؟“ اس نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”بچی ہے، مزاروں کے درمخکھٹائی رہتی ہے۔ اب دیکھو تمہیں پکڑ لائی ہے اور یہ تم ہی تھے کالج گئے، کوئی روایتی فلم پروڈیوسر ہوتا تو کبھی نہ آتا۔“ اسے میں نے باہر صحن کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے نا ساز کو لیے رہنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل کر دروازہ کھولا تو سنبل چائے کے گواڑ مات لیے کھڑی تھی۔ ”آپ نے یہ سب تکلف کیوں کیا؟ میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں سنبل۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ اسے بچائیں ہڈی زاو صاحب، آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں۔ ہمارا واحد سہارا اب آپ ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا ہونا نا ساز کو۔۔۔۔۔“ سنبل کی آنکھیں جھلک پڑیں ”اسے کینسر ہے، اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آخری اسٹیج پر ہے اس کا کینسر۔۔۔۔۔“ میرے ہیروں تلے زمین یک دم سرک گئی۔

(جاری ہے)

باقیم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، منسلک کے معروف و منفرد رمانائزر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پڑھائی حاصل کی، تو جنگ، سٹوڈنٹس میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تفضیحی کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدر رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازी تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مستحویٰ ہے گا۔ جارا پادوی پرانا ہے:

ایڈیٹر: ”سٹوڈنٹس میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، ماہنامہ منزل، آئی آئی چندر گھر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سنبل چائے رکھ کر کمرے سے باہر نکلے، تو میں نے ناساز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”جلو میرے ساتھ، اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ دنیا کے کسی کو نے بھی، جہاں تمہارا علاج ممکن ہو، تمہیں وہاں پہنچانا اب میری ذمہ داری ہے۔ اٹھو، جلدی کرو۔“ ناساز نے مجھے کھینچ کر دوبارہ دھکا دیا ”بہت دیر ہو چکی ہے پری زاد..... اب مجھے نہیں رہنے دو۔ یہ کمرہ، یہ قہرانی اب یہی میری سنگت ہے، اور پھر یہاں دوپٹگی بھی تو ہے نا..... مجھے ان سب کے ساتھ رہنے دو“۔ میں نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا، ساری زندگی دوسروں کو جیسے کا درس دیتے رہے اور آج خود زندگی سے بھاگ رہے ہو، ایسا کیوں کرو؟“ میرے بارے میں ناساز نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ”زندگی خود مجھ سے دامن چھوڑنے کی فکر میں ہے پیارے، میں ہی دھنوں کی طرح اس کے دامن سے لپٹا ہوا ہوں۔ ہاں، اب اگر مرنے بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں۔ میرے جانے کے بعد تم سنبل کا خیال رکھو گے نا پری زاد.....“ میں نے دامن پلٹنے سے پہلے لہو بھر کے لیے اسے دیکھا ”کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں تمہیں کچھ ہونے نہیں دوں گا میرے شاعر بدنام، کل تیار رہنا۔ تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔“ ناساز نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور شرارت سے بولا۔ ”تفصیل بجا ہے، کہ مجھے شوق ہوا ہے..... نئے میں لکھوان سے ملاقات مسلسل“

اگلے روز یعنی کی گیلری میں بھی میرا وھیان ناساز کی طرف ہی لگا رہا۔ یعنی نے ختمی طور پر چند زاویے درست کیے اور مجھے کے سامنے سے بہت گئی۔ ”بس جناب، ہو گیا کھلنا“۔ اس کی آواز سے جوش چمک رہا تھا ”جائیں ناں پری زاد۔ کیا بتانا ہے آپ کا اسٹیچر.....؟“ میں اپنے خیالات کی دنیا سے چونک کر پلٹا۔ اور پھر میری نظر یعنی کے بنائے جیسے پر پڑی تو آنکھیں ٹھکلی کی ٹھکلی رہ گئیں۔ میں بے اختیار اٹھ کر جیسے کے قریب آ گیا۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں، احتسابہ داغ، خوب صورت، مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ، ایسا چہرہ تو میں نے کبھی آئینے میں نہیں دیکھا تھا۔ یعنی میری حالت سے بے خبر اپنی دھن میں بولے جارہی تھی ”میں اپنی پوروں کی آنکھوں سے آپ کو ایسا دیکھتی ہوں پری زاد..... جائیں ناں، کتنا قریب تر ہے یہ آپ سے، آپ پُپ کیوں ہیں، بولتے کیوں نہیں، کیا میں نے بہت بُرا بتایا ہے۔ کچھ تو بولیں، چلیز.....“ وہ پریشان ہی ہو گئی۔ میری آواز کی لرزش خود میرے لیے بھی اٹھتی تھی ”نہیں، تم نے دنیا کا سب سے خوب صورت چہرہ تراشا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ پیاری لڑکی میں تو وہ ہوں، جسے دیکھ کر آئینے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، سرسراتی ہوا میں گھبرا کر ختم جاتی ہیں، سورج مدہم پڑ جاتا ہے اور چاند کی چاندنی جتنی کرنیں برسائے لگتی ہے۔ وہ ترپ کر میرے قریب آ گئی“ ایسا کیوں کہتے ہیں آپ، میری انگلیوں کی پوریں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، یہ میرے سن کی تصویر مٹی کے قالب میں ڈھالی ہیں، سچ بتائیں، اس چہرے کے خدو خال آپ کے چہرے جیسے نہیں ہیں کیا.....؟“ میری آواز بھڑا گئی۔ ”ہاں بلاشبہ، خدو خال، نقوش، آنکھیں سب میرے چہرے سے مشابہ ہیں، مگر جو ٹور، حسن، وجاہت تمہاری پاکیزہ انگلیوں کی کاری گری نے اس مجھے میں منتقل کر دی ہے، میرے پاس ایسی کوئی روشنی، کوئی حسن نہیں۔“ وہ رو پڑی۔ کاش میں اسے یہ بات سمجھا سکتا کہ دنیا اس کے کل سن کی آنکھوں سے نہیں دیکھتی۔ وہ دنیا ہی ظاہر پرست ہے۔ وہ جانا چاہتی تھی کہ آج میں اتنا داس کیوں ہوں۔ میں نے اسے اپنی اور ناساز کی دوستی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ یعنی نے ناساز سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میں شام ڈھلے اس کے گھر سے واپسی پر اسے بھی اپنے ساتھ ناساز کے گھر لے آیا۔ ناساز نے یعنی کو میرے ساتھ دیکھا، تو حسبِ عادت مصرع اس کے ہونٹوں سے پھسل گیا ”تنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں.....“ میں نے اُن دونوں کا تعارف کروایا۔ ناساز نے شرارت سے میری طرف دیکھا ”سو، اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں.....“ میں نے اسے گھور کر دیکھا ”باز آ جاؤ، یعنی تم ہی اسے سمجھاؤ کہ اپنی ضد چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلے۔ دنیا کی کوئی بھی بیماری علاج نہیں ہوتی۔ کوشش کرنا تو ہمارا فرض ہے۔“ یعنی اور ناساز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناساز نے فلم کے لیے لکھے اپنے غصے یعنی کو سنائے۔ کچھ دیر بعد سنبل بھی آ گئی اور حسبِ معمول دوا کیوں کے اسٹے ہوتے ہی باقی ساری باتیں بس منظر میں چلی گئیں۔ دو دنوں ایک دوسرے میں ایسی گم ہوئیں کہ باقی سب بھول گئیں۔ کہتے ہیں، دوا لڑکیاں جب پہلی بار ملتی ہیں تو عموماً ڈھالی تین گھنٹے کی تعارفی ملاقات کے بعد ایک دوسرے سے ان کا پہلا سوال ہوتا ہے ”ویسے تمہارا نام کیا ہے.....؟“ وہ دونوں بھی برآمدے میں بیٹھی شاید ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہی تھیں۔ ناساز سرک کر میرے قریب آ گیا ”تم تو بڑے نیچے رستم نکلے پری زاد پیارے..... ایسی پری ساتھ لیے پھرتے ہو کہ جس کی پہلی جھلک ہی دھڑکنیں روک دے۔ اور پھر بھی کہتے ہو کہ دل ابھی دیران ہے۔“ میں نے ڈکھ سے باہر بیٹھی یعنی کی طرف دیکھا۔ ”وہ دیکھ نہیں سکتی، اس لیے میرے ساتھ ہے، ورنہ دوسروں کی طرح یہ رشتہ بھی تنہیک یا ہمدردی کے قالب میں ڈھل جاتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں خود اسے دھکا دے رہا ہوں۔ اس کے ساتھ چل کر میں نہ صرف خود کو بلکہ اس معصوم، اُن جان لڑکی کو بھی لوگوں کے مذاق کا باعث بن رہا ہوں۔“ ناساز میری بات سن کر خاموش سا ہو گیا ”میں باقی ساری دنیا کی طرح یہ کہہ کر تمہارے دھنوں پر ٹپک نہیں چھڑکوں گا کہ دولت ہر مرض کا علاج ہے، لیکن تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ اگر تم اپنے اندر کی اس آواز کو دبا نہیں سکتے تو پھر اپنا چہرہ بدل ڈالو۔ آخر تک خود کو اسے اُن دیکھے عذاب کی بجھی میں جھونکے رکھو گے؟“ میں نے چونک کر ناساز کی جانب دیکھا ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ آج کل کیا ممکن نہیں، صرف جیب میں دسڑی ہونی چاہیے، جو ماشاء اللہ اب تمہارے پاس بہت ہے۔ کہیں بھی بیرون ملک جا کر پلاسٹک سرجری کروالو۔ آج کل تو ساری دنیا کو چہرہ بدلنے کا خطہ سوار ہے۔ اچھے خاصے لوگ علاج کے بہانے اپنے چہرے کی نوک پلک سنوارنے کے لیے پلاسٹک سرجری کروا لیتے ہیں۔ تو پھر اگر تم بھی اپنی جون بدل لو گے، تو پھر کون سی قیامت آ جائے گی۔ اتنے میں وہ دونوں اندر چلی آئیں اور ناساز نے بات بدل دی۔

رخصت ہوتے وقت ناساز نے یعنی سے کہا ”سنو لڑکی، آج میں تمہیں دو بات بتاتا ہوں، جو آج سے پہلے تمہیں شاید کسی نے نہ بتائی ہو۔ تمہاری آنکھیں دنیا کی سب سے خوب صورت آنکھیں ہیں۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ جلد ہی یہ آنکھیں اس دنیا کے سارے رنگ دیکھ سکیں گی۔“ یعنی کی چپکلیں نم ہو گئیں اور ہم وہاں سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ لیکن میرا وھیان ساری رات ناساز کی پلاسٹک سرجری والی بات میں الجھا رہا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے، پیدائش سے لے کر آج تک مجھے جن غذاؤں کا سامنا رہا ہے، وہ سب الجھتیں، کرب اور عذاب ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو جائیں گے کیا؟ مگر پھر بھری شناخت

اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش نہ کر دیں تو میں اپنے چہرے کھلے کر ان کے اوارے کی شرط پر پورا اترنے کو تیار ہوں۔ میں نے رات گئے لیے میل پال کو بھیجی اور وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک کر آنکھیں موند لیں، صبح سویرے پرندوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو پال کی میل میرے ان باکس میں نمایاں تھی۔ میں نے جلدی سے اسے کھولا اور تحریر پر نظر پڑی دوڑائیں۔ وہ میل، پال نے ادارے کے آفیشل میل اکاؤنٹ سے نہیں کی تھی، بلکہ اپنے ذاتی پتے سے بھیجی تھی۔ یہ میل میں اپنے ذاتی پتے سے بھیج رہا ہوں۔ تمہاری میل نے مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مشرقی لوگوں کے جذباتی ہونے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا تھا، مگر تمہاری جذباتیت تو دنیا سے جدا ہے، ٹھیک ہے لڑکے، اگر تمہاری یہی خصلت ہے، تو میں تمہارے بارے میں کچھ سوچوں گا، لیکن یہ سب کچھ میری ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ کیوں کہ میرا ادارہ بہر حال اپنے اصولوں کا پابند ہے۔ میں تمہیں چند ضروری نمٹ لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ پہلے تم اپنے منکک کے کسی مستند ملٹی ادارے سے یہ ابتدائی نمٹ کروا کر مجھے بھیج دو۔ پھر جب تمہارے آنے کی ضرورت پڑی، تو میں تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ تب تک خدا کے لیے کوئی ایسی سیدھی حرکت مت کرنا۔ تمہارا مخلص، ڈاکٹر پال جوز۔“ میں نے میل پڑھ کر ایک لمبی اطمینان کی سانس بھری۔ گویا میری سمت طے ہو چکی تھی۔ اور سفر چاہے کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے اس کی سمت طے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے خود کو ہلکا چھاکا محسوس کیا۔ انسان زندگی میں بہت سے بوجھ ڈھونڈتا ہے، مگر ان میں سب سے بھاری بوجھ شاید خود ہماری اپنی سوچ، ٹھکر کا ہوتا ہے۔ دفتر پہنچا تو لٹنی اور ڈائریکٹر پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ لٹنی نے شکوہ کیا کہ میں فلم کے مراحل میں پوری دل چسپی نہیں لے رہا ہوں، جب کہ وہ چاہتی ہے کہ ہر شعبے پر میری ذاتی نگرانی اور گرفت رہے۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دہی کہ ہم بہت جلد کانوں کی فلم بندی کے لیے کیئذہ روانہ ہونے والے ہیں۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے، میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سب کو فلم کے کانوں کی فلم بندی کا تیار کر یونٹ کے ساتھ کیئذہ چلا جاؤں گا، جہاں تین چار مہینے علاج کے لیے رکھنے کا کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈنا ہوگا۔ شاید چھ ماہ بھی لگ جائیں، مگر مجھے کسی طور یہ معرکہ سر کرنا ہی تھا۔

اس وقت، میں چاہتے ہوئے بھی سر جری کے بعد کے حالات پر کوئی سوچ بچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر اور زود بین ہوتے ہیں۔ جن فیصلوں میں ہمارے دل کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ان کے اثرات سے نظریں پڑانے میں ذرہ برابر بھی تاثر نہیں کرتے، میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ایک بار اپنی مرضی کی سر جری کروا لوں، بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں نے ایک ڈور دروازے کے بڑے اسپتال سے ڈاکٹر پال کے بتائے ہوئے ملٹی سرجن کے لیے حوالے سے اور آپ مجھے ان کی رپورٹ آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ مجسمہ بن جانے کے بعد یحییٰ کے گھر جانے کا کوئی خاص بہانہ نہ ہونے کے باوجود میں بٹنے میں ایک آدھ پچھر اس کے گھر کا ضرور لگا لیتا تھا۔ کچھ گھنٹاں اور کوچہ اپنی سمت بلانے کے یہاں خود تراش لیتے ہیں۔ جانے وہ من موٹی ہی لڑکی کس طرح چند دنوں ہی میں میرے دل کے ہر خانے پر اپنا قبضہ جما بیٹھی تھی۔ حالاں کہ میں نے تو اس دل کے کواڑ سدا کے لیے بند کر کے چاہی کسی دریا میں پھینک دی تھی۔ یا پھر شاید مجھ جیسوں کے دل ہمیشہ کسی غلط اور مہربان ساتھی کی دستک ہی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ شام کو دفتر سے اٹھتے وقت اچانک فون پر سنبل کی گھبراہٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”آپ جلدی سے شوکت خانم اسپتال پہنچیں۔ آپ کے دوست کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔“ میں سب چھوڑ چھاڑ کر کبیر کے ساتھ اسپتال کی طرف بھاگا۔ راہ داری میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے میرے قدموں سے چان نکلتی جا رہی تھی۔ ناساز کا رنگ سروس کی طرح بیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے آہستہ پر آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر تنگ سوکھے پتے جیسے ہونٹوں سے بے مشکل مسکرایا۔ رست روک رہی ہے، تھوڑی جان ہے باقی..... جانے ٹوٹے دل میں کیا ارمان ہے باقی..... جانے بھی دے اے دل..... سب کو میرا سلام..... میں چلا، میں شاعر بدنام..... نہیں چلا، محفل سے ناکام..... نہیں چلا.....“ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کہیں نہیں جا رہے ہو تم، سنا تم نے، میں اس شاعر کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔“ اس کے سر ہائے کھڑی سنبل اور استاد بٹے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ بے مشکل آنکھیں کھول کر بولا۔ ”دیکھا ہی زار پیارے، یہ تو واقعی اسی فلم کا سین بن گیا یا ر۔ لگتا ہے، جیسے میری کہانی ڈائریکٹر نے تیس چالیس سال پہلے فلما دی تھی، مگر یا ر، میں بہت تکلیف میں ہوں۔ یہ جان تو نکلتے نکلتے جان نکال دیتی ہے۔“ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”پپ ہو جاؤ، خود کو طحال مت کرو۔“ ”نہیں پیارے، بولنے دو مجھے۔ بس آخری تھکن ہے، اس کے بعد تو آرام ہی آرام ہے۔“ ناساز نے سنبل کی طرف دیکھا۔ ”یہ کہانی بھی ادھوری رہ گئی ہے زار۔“ میرے جانے کے بعد ان باپ بچی کا پورا خیال رکھنا۔ اور جب تمہاری فلم ریلیز ہو تو اس کے ٹائٹل میں میرا نام.....“ ناساز بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کا چہرہ چھپھپھایا۔ ”ناساز..... پپ کیوں ہو گئے، بولتے کیوں نہیں..... تم ہم سب کو اتنا بڑا دھوکا دے کر نہیں جاسکتے، بولو، بے وفا، دغا باز..... کچھ تو بولو..... بات کرو.....“ میری چیخیں سارے اسپتال میں گونج رہی تھیں۔ استاد بٹے نے اسپتال کے عملے کی مدد سے مجھے ناساز کے بے جان جسم سے ڈور کر دیا۔ میں چٹخا چلا تارہ گیا۔ استاد بٹے نے دبوچ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”پپ کر جاؤ..... ناساز اب کبھی نہیں بولے گا، وہ مر چکا ہے۔“

(جاری ہے)

باہم ندم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ٹھنک کے محروف و منفرد رمانا راتر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دمیر“ نے بین الاقوامی پے پرانی حاصل کی تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدرہ رکھ چکے ہیں۔

”پری زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قد رے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز کی تحریر ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب اس ظاہر پسند و زور پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز محبت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرا نا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھروڑ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناساز کے جانے کے بعد میرا دل ہی اٹھ گیا، کسی کام میں من نہیں لگ رہا تھا میرا، بس سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ ناساز کا چہرہ آنکھوں کے سامنے سے جتا ہی نہیں تھا۔ کچھ لوگ اپنی تقدیر میں صرف دروہی نکھوا کر لاتے ہیں۔ ٹکھ کی سیاہی شاید ان کی باری آنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایسی ہی ایک آواں شام، جب میں اپنے اندر صرے کرے میں بیٹھا قسمت کے اس ہیر پھیر سے متعلق ہی سوچ رہا تھا، تو مینی آگئی۔ ”کیوں مرزاوے رہے ہیں خود کو، ہم میں سے کوئی بھی ناساز کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس کا جانا تھا، سو وہ چلا گیا۔ مگر ہم سب ابھی سہیں ہیں، ہماری خاطر ہی سہی، خود کو سنبھالیں۔“ میں نے اپنی نم آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ”اگر سب کا جانا طے ہی ہے، تو پھر ہم سب ایک ساتھ ہی کیوں نہیں چلے جاتے، یہ باریاں کیوں لگا دی گئی ہیں۔“ یعنی میرے قریب بیٹھ گئی۔ ”باریاں اس لیے لگائی گئی ہیں کہ ہم جانے والوں کے بعد ان کے بچوں کا دھیان رکھیں۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ وہ سنبھل اور استاد بنے خان کی ذمہ داری آپ پر ڈال گئے ہیں۔ کیا انہیں کوئی نئی تہا چھوڑ دیں گے پری زاو؟“ کیا ستم ہے کہ ہوا کے سب رستے، سب روزیں بند کر دینے کے بعد، زندگی میں سانس لینے پر بھی مجبور کرتی ہے، کیوں کہ جینا تو ہے۔ ہاں، جینا تو پڑے گا، مزید ستم سننے کے لیے، نئے گھاؤ جھیلنے کے لیے۔ اگلے ایک ہفتے نہیں شہر کی ایک نئی بستی میں استاد بنے خان کے لیے ایک گھر کا انتظام کر دیا گیا، جہاں وہ اپنی موسیقی کی اکیڈمی اور کلاسز بھی شروع کر سکتے تھے۔ کمائی نے اس سارے معاملے میں بہت بھرتی دکھائی اور وہ مفتوں بعد ہی میوزک اکیڈمی کا اشتہار بھی شہر کے بڑے اخباروں کے پہلے صفحے پر لگ گیا، مجھے یقین تھا کہ اب ان باپ بیٹی کو اپنی گزر بسر کے لیے کسی کے آگے سوال دراز کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میری اس عرصے میں خود سے خود کی ملاقات بہت کم ہو پائی تھی، مگر جیسے ہی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا اور میں نے جانے کتنے دن بعد آئینہ دیکھا، تو مجھے ایک دم ہی ڈاکڑ پال کی یاد آگئی۔ میں نے اپنی اسی میل کھولی تو ڈاکڑ پال کی تین مٹھو آچکی تھیں، جس میں اس نے میرے کراوے گئے پٹنی تجزیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے اگلی صبح ہی رپورٹ لے کر اُسے ای میل کر دی۔ کمائی اس عرصے میں فلم ہیوٹ سے سلسل رابطے میں تھا، اور مجھے وقتاً فوقتاً پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ کینیڈا میں فلم بندی کے انتظامات بھی وہ مکمل کر چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کینیڈا روانگی سے قبل یعنی سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ اب اس زندگی کے تپے صحرا میں تہا چلتے چلتے میرے پاؤں اتنے آبلہ پا ہو چکے ہیں کہ خود میرے قدموں کے چھالے مجھے ڈھکی دھکی دیتے ہیں کہ انہیں اب کسی ہم سفر کے ساتھ کی چھاؤں دیکھا رہے۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا وہ میری ٹھہر کر ہم سفر بنا قبول کرے گی، کیا وہ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھتی ہے، کیا وہ میری تمام زندگی کی محرومیاں قسم کر کے مجھے اپنا سکتی ہے.....؟ میں نے راستے میں گاڑی رکوا کر پھول والے سے مینی کے لیے ایک گل دستہ بنوانے کا سوچا لیکن پھر بہت دیر تک وہاں کھڑا پھولوں کا انتخاب کرتا رہا، دنیا کے سارے پھول بگھڑیوں سے بھرا کر بیٹے ہیں، مگر جب خود کسی بگھڑی جیسی کو گلاب پیش کرنا ہو تو کوئی چٹاؤ کیسے کرے۔ ہر پھول اس کے سامنے بچ لگتا تھا۔ ہر رنگ اس کے آگے پھیکا پڑ جاتا تھا۔ مجبوراً مجھے کچھ پھیکے رنگوں والے کم صورت گلابوں ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ مد مقابل جب ”گلاب تر“ ہو تو پھولوں کو بھی بار ماننا ہی پڑتی ہے۔

میں بہت دیر اس کے گھر کے دروازے پر کھڑا رہ کر اپنی الجھتی سانسیں درست کرتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا، جیسے حسن کی عدالت میں یہ میری پہلی پیشی ہے۔ دوسری گفتنی کے جواب میں اندر سے قدموں کی آہٹ ابھری اور میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ گل دستے پر میری گرفت خست ہوئی اور پھر دروازہ کھٹکا تو میرا ہاتھ ہوا ہی میں بلند رہ گیا۔ اندر سے نکلنے والا نو جوان میرے لیے قطعی انہی تھا۔ ”جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ میں اُسے دیکھتا رہ گیا، لمبا قد، کھلتی رنگت، بکھرے کھڑے سے بال، مہری سیاہ آنکھوں میں عجیب سی کشش آمیز چمک، وہ مردانہ وجاہت کا بیکر تھا۔ وہ غور و با اعتماد اور مفرود سادہ لڑکا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میرا گل دستہ والا ہاتھ میکانیکی طور پر خود بخود پیچھے چلا گیا۔ میں نے گڑبڑا کر اس سے پوچھا ”تم کون ہو.....؟“ وہ لڑکا منس پڑا۔ ”لو، وہ بھی تم سے پوچھتے ہیں.....؟ جناب ہم اپنا تعارف خود آپ ہیں۔ ڈاکٹر عدنان کہتے ہیں مجھے، یہ میری خالہ کا گھر ہے اور میں آج ہی اس میں نازل ہوا ہوں۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟“ میں نے اپنے ذولتے دل کو سنایا۔ ”میں مینی کا دوست ہوں، پری زاو نام ہے میرا۔“ عدنان نے غور سے مجھے دوبارہ دیکھا اور پہلے لفظ کو کافی لمبا کرتا ہوا بولا ”اچھا..... تو آپ ہیں پری زاو..... گریت..... سر کھالیا ہے، اس پاگل لڑکی نے صبح سے آپ کا ذکر کر کر کے۔ بچ ہاؤں، تو میں آپ سے چمکیس ہو رہا تھا۔“ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا وہ زور سے منس پڑا۔ رُامت مایے گا، مذاق کی عادت ہے میری۔ اندر آئیں ناں۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ خالہ اور مینی اندر ہی ہیں۔“ میں پچ چپا اس کھلڈرے سے لڑکے کے پیچھے اندر داخل ہو گیا، پھر ہاتھوں میں بیکرا گل دستہ نہ جانے کب میرے ہاتھ سے کمرے کے گل دان میں منتقل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مینی بھی آگئی، وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ”ارے آپ آگئے پری زاو..... دیکھیں، کون آیا ہے۔ میرے بچپن کا ساتھی۔ میرا سب سے بہترین دوست، میرا کزن عدنان۔“ بچا کہیں، اس نالائق کو کچھ کر ذرا بھی نہیں لگتا ناں کہ یہ ڈاکٹر ہوگا۔ حرکتیں تو ابھی تک وہی گلی کے آوارہ لڑکوں جیسی ہیں اس کی۔“ عدنان نے زوردار قہقہہ لگایا ”تو گلی کا لڑکا ہی تو ہوں۔ تمہاری گلی کا ایک آوارہ، جو گھٹنوں دوپہر میں تمہارا کالج سے واپسی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یاد ہے ناں مینی.....“ وہ دونوں زور سے منس پڑے، جانے کیوں ٹھیک اسی لمحے میں نے خود کو دہاں سے حد انہی سامنے کیا، بال تک مینی دروہار مجھے کہتے مانوس، کہتے مہربان سے محسوس ہوتے تھے، اور آج ایک انجینی کے آجانے سے میں خود بیگانہ سا ہو رہا تھا۔ مینی نے مجھے بتایا کہ عدنان نے طب کی تعلیم کے بعد آنکھوں کی فیلڈ میں اسپیشلائز کیا ہے اور اب اس کی پوسٹنگ اسی شہر میں ہو چکی ہے۔ عدنان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی پوری تن دہی سے مینی کی آنکھوں کے علاج کی کوئی صورت نکالنے میں لگا ہوا ہے۔ عدنان اور مینی ایک دوسرے سے بہت بے تکلف محسوس ہوتے تھے اور دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے رہے تھے۔ جب تک مینی کی ماں رات کے کھانے کے انتظام کے لیے باورچی خانے میں مصروف رہیں، دونوں بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنستے رہے۔ مینی نے عدنان کو ٹوکا ”بس..... رہنے دو یہ تاملی داری کی باتیں، خوب جانتی ہوں میں کہ جناب کڑی دو چہروں میں کس کے لیے دھوپ چانا کرتے تھے۔ کیا تھا تمہارا عینکی کا۔ ہاں، ٹھہرت اور وہ دوسری چھینی مدروش اور وہ تیسری.....“ عدنان نے جلدی سے اسے روکا۔ ”اوہو، بس بھی کرو، وہ پچھتا ہا میرا..... اور انہی دو چار معاشرے نما دوستیاں تو سچی کرتے ہیں لڑکپن میں۔ کیوں پری زاو صاحب، ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں، آپ نے بھی کی ہوں گی۔ کچھ خواب تو پالے ہوں گے، اس عمر میں آپ نے بھی.....“ میں نے غور سے عدنان کی طرف دیکھا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب! خواب پالنے کے لیے نیند کے کچھ خوب صورت

”پالنے“ بھی ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو آج تک نیند کا وہ ”پالنا“ ہی دیکھتا رہا ہوں۔ نیند آجائے تو شاید کبھی خواب بھی پال سکوں۔“ عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا ”واہ، میری بیماری کزن یونہی آپ کی اتنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی، بڑی گہری بات کہہ دی آپ نے۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا ”اب میں اجازت چاہوں گا۔ ان شاء اللہ جملہ ملاقات ہوگی۔“ وہ دونوں بولکھلا سے گئے۔ یعنی جلدی سے بولی ”ارے، آپ کہاں چل دیئے، اسی نے کھانا لگا دیا ہے اور آپ نے تو آنے سے پہلے فون پر کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے، بتائیں ناں.....؟“ عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے بات بنائی ”ارے ہاں، یاد آیا۔ فلم کا یونٹ کیپڈ اجار ہا ہے۔ شاید میں بھی جاؤں، سوچا تم سے بھی پوچھ لوں۔“ یعنی خوشی سے چلائی ”واہ زبردست! کاش میں بھی ساتھ چل سکتی، مگر اب یہ صاحب جو تشریف لے آئے ہیں، میرے دشمن جاں..... یہ مجھے کہاں جانے دے گا اب۔“ میں نے چونک کر یحییٰ کی طرف دیکھا ”کیوں؟“ عدنان نے جلدی سے دخل دیا۔ ”پڑی زاد صاحب! آپ ہی سمجھا کہیں اس لڑکی کو۔ میں نے امریکا کے ایک بڑے ملٹی ادارے سے یحییٰ کی آنکھوں کے میچنگ لینز کی بات کی ہے، وہ لوگ تو نے فی صد پر امید ہیں کہ وہ یہ آپریشن کر سکتے ہیں اور انہیں مشابہت والا قریب بھی مل جائے گا، کیوں کہ آج کل باہر کے ملکوں میں عموماً سڑے موت کے قیدی یا بستر مرگ پر پڑے مریض اپنے اعضاء مرتے وقت دان کر جاتے ہیں یا اپنے بیوی بچوں کی آنکھوں کفالت کے لیے ہماری رقم کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ میں نے یحییٰ کے میچنگ لینز کے لیے ایسے کئی اداروں میں رجسٹریشن کروا رکھی ہے اور وہ لوگ قریب ملتے ہی ہمیں اطلاع کر دیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے وقت میں یحییٰ کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہمیں دیر ہو جائے۔“ یحییٰ نے حتیٰ لچے میں کہا۔ ”خواب دیکھنا چھوڑ دو مائی ڈیزیز کزن ڈاکٹر عدنان! پہلے تو یہاں سے امریکا جانے کے لیے ہی لاکھوں روپے چاہیے ہوں گے، اور پھر ڈونیشن اور آپریشن کا خرچہ الگ۔ کہاں سے آئیں گے اتنے روپے.....؟ اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف اپنی جمع کی ہوئی رقم ہی سے اپنا آپریشن کرواؤں گی۔ اور ہم دونوں یہ بات بہت پہلے طے کر چکے ہیں۔ سو نومبر بھٹ اوکے.....“ وہ دونوں بیچوں کی طرح بحث کرتے رہے۔ میں نے یحییٰ سے اجازت چاہی اور ہماری قدموں سے وہاں سے اٹھ آیا۔

سارے راستے ان دونوں کی ٹوک جھونک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ عدنان کو یحییٰ سے بے تکلف ہوتے دیکھ کر ایک عجیب سی بے چینی میرے رگوں میں پھیلنے جاری تھی۔ مگر تو یحییٰ بھی تو اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلفی سے پیش آ رہی تھی۔ جنہیں ہم چاہتے ہیں، وہ کسی اور سے بے تکلف ہو کر بات کریں تو ہمارے خون کی گردش کیوں ختم ہوتی ہے۔ کانوں جیسی ٹیمپن اور کنک ہمارے وجود کو کیوں پھلتی کر کے لگتی ہے؟ کیا اسی کو رقابت کہتے ہیں۔ ساری رات میں اپنے بستر پر گھومیں بدلتا رہا۔ یہ رقابت تو محبت سے بھی زیادہ جان لیوا آزار ہے۔ اگلے روز ٹیلی فون کی ہر گھنٹی میں میں چونک جاتا۔ مگر یحییٰ تو جیسے عدنان کے آنے کے بعد بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ مجھے چڑچڑاہٹ سی ہونے لگی اور میرا عملہ اس کا نشانہ بننے لگا۔ کمالی نے یہ بات نوٹ کر لی اور تیسرے دن ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ مجھے کوئی پریشانی ہے۔ میں اُسے کیا جانتا، مجھے تو خود چاہتا نہیں تھا کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ مگر جو تھے روز جب میرے پی اے نے جب مجھے اطلاع دی کہ ”مس قراۃ العین آپ سے ملنے آئی ہیں“ تو ایک لمحے میں ساری بے چینیوں، ساری بتائیاں جانے کہاں ہوا ہو گئیں اور میں حیزی سے ملاقاتی کمرے کی طرف لپکا، مگر وہ تنہا نہیں آئی تھی۔ عدنان بھی اس کے ساتھ تھا۔ میری آہٹ سننے ہی وہ ناراضی سے بولی ”کہاں غائب ہیں آپ، تین دن سے، نہ کوئی فون نہ کوئی خبر خبر۔ میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ جان لیں اچھی طرح۔“ میں نے مصروفیت کا بہانہ کیا، مگر وہ روٹھی رہی، عدنان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”بڑی ضدی ہے یہ بچپن سے سر۔ مجھ سے پوچھیے؟“ میں نے گہری نظروں سے اس شخص ناراض کو دیکھا، سفید لباس اور سیاہ دوپٹے میں وہ نور کا ایک ہالہ لگ رہی تھی۔ ”چلو کچھ جرمانہ طے کر دو، میری غیر حاضری کا۔“ آخر کار، بات یوں بنی کہ مجھے اُن دونوں کو رات کے کھانے پر شہر کے ایک مشہور واپن انڈرستور میں مدعو کرنا پڑا۔ عدنان نے جاتے وقت یحییٰ کے کمرے سے نکلتے ہی جلدی سے مجھے بتایا کہ یحییٰ کے لیے میچنگ لینز کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر یحییٰ جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عدنان نے وہ لفظوں میں مجھ سے رات کو یحییٰ کو منانے کی درخواست کی۔ اپنا آبائی گھر بیچ کر یحییٰ کا علاج کروانا چاہتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد مجھ سے وہی ہزار خدشے، ہزار دوسرے، مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میری محبت ریت کے ڈنڈوں کی طرح میری مُٹھی سے نکلتی جا رہی ہے۔ رات کو رستور میں یحییٰ کی ٹیمبل پر وہ دونوں مجھ سے پہلے موجود تھے۔ کتنے مکمل لگتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ، جیسے دو بٹنوں کا جوڑا ہو۔ کوئی ہم تینوں کو وہاں ایک ساتھ بیٹھنے دیکھتا، تو اسے میرا وجود ہی اضافی لگتا۔ عدنان کی کوئی فون کال آئی تو وہ اٹھ کر ڈرافٹ سے پر چلا گیا۔ یحییٰ نے میری خاموشی محسوس کر لی۔ ”آپ اتنے چپ چاپ سے کیوں ہیں پڑی زاد..... آج دن کو بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ گم ضم سے ہیں۔“ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، تم عدنان کی بات مان کیوں نہیں لیتیں۔ وہ تمہارے ہی بھلے کی بات کر رہا ہے۔“ یحییٰ نے لمبی آہ بھری ”اچھا..... تو ڈاکٹر صاحب کا جادو آپ پر بھی چل گیا۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”ہاں، وہ ہے ہی ایسا جادوگر۔ آج کل چاروں طرف مجھے اسی کا سحر محسوس ہوتا ہے۔“ یعنی ہنس دی۔ ”ہاں، ٹھیک کہا آپ نے، جتا ہے پڑی زاد، میں نے سات سال کی عمر کے بعد عدنان کو نہیں دیکھا، جانے اب کیسا دیکھتا ہوگا۔ پہلے تو ہر وقت مٹی میں آثار بتاتا تھا۔ بڑی مار پڑتی تھی اُسے خال سے۔ آپ کو ایک بات بتاؤں پڑی زاد۔ میری زندگی کی بہت بڑی خواہش تھی کہ جب بھی میری بیانی واپس آئے،

میں سب سے پہلے عدنان ہی کو دیکھوں۔ ہاں، مگر اب اس فہرست میں ایک اور ہستی بھی شامل ہو چکی ہے، اور وہ آپ ہیں پڑی زاد..... اب میں عدنان کے ساتھ آپ کو بھی پہلی نظر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میرا دل چاہا کہ اس سے کہوں کہ کہاں میرے اور کوئلے کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہی ہو۔ دیکھے جانے کے قابل صرف عدنان ہے۔ اتنے میں عدنان بھی واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ ”جی پڑی زاد صاحب! کچھ آیا اس بگلی کی عقل میں یا نہیں۔ اسے سمجھا کہ اب ان کے غلوں کو یوں ٹھکرا کر نہیں کرتے۔“ یحییٰ نے احتجاج کیا۔ ”ایسی بات نہیں ہے، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ تمہارے پاس تمہارے آبائی گھر کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اور پھر ہم دونوں کے بچپن کی اور خالہ کی کتنی یادیں وابستہ ہیں اُس گھر سے، میری نظر میں وہ سب یادیں میری بیانی سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ بس، ہو گیا فیصلہ۔ تم دو گھر بھی نہیں بچو گے۔ اور اگر بھی تم نے ایسا کیا تو ساری زندگی مجھ سے بات مت کرنا۔“ عدنان نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا، میں نے دخل اندازی کی ”تم دونوں خواتوا، جھگڑو۔ جو۔ یعنی پر میری دوستی کے بھی کچھ قرض باقی ہیں اور میں اسی دوستی اور رشتے کے حق سے آج یہاں یہی کہنے آیا ہوں کہ یحییٰ کے علاج کا تمام خرچہ میں برداشت کروں گا، کیا ہیرا! اتنا جتنی حق نہیں ہے۔“ ”نہیں پڑی زاد! ایسا مت کہیں، میں آپ سے رقم نہیں لوں گی۔ میں نے زندگی بھر ایک جی خودداری کا بھرم ہی تو کھایا ہے۔ کیا آپ دونوں مجھ سے میری عمر بھری یہ یہ واحد کمانی بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ کیا فائدہ ایسی بیانی کا کہ جس کے ملنے کے بعد بھی میری نظر تمام عمر جھلکی رہے۔ چلیز، آپ ایسا نہ کریں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے، اگر تمہاری یہی مرضی ہے، تو یوں ہی سمجھو، پھر تمہیں میری بھی ایک بات ماننا ہوگی۔ میں عمر بھر تمہاری خودداری کا یہ بھرم قائم دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن تمہارا علاج بھی اسی قدر ضروری ہے، لہذا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال عدنان کا آبائی گھر میں خرید لوں گا۔ مکان کی رقم سے عدنان تمہارا علاج مکمل کروائے گا، لیکن تم دونوں کے بچپن کی یادوں کا مسکن وہ گھر، میرے پاس عدنان کی لمانت کے طور پر رہے گا۔ عدنان جب بھی رقم جمع کر لے گا، مجھ سے اپنا مکان واپس لے سکتا ہے۔“ یحییٰ نے بے چینی سے پہلو ہلا ”لیکن.....“ ”کوئی اگر مگر، لیکن نہیں سنوں گا نہیں، بس طے ہو گیا۔ تم لوگ جانے کی تیاری کرو، آج کل دیئے بھی اچھے ڈاکٹروں کا کال پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے عدنان کچھ ہی برس میں اپنا مکان واپس حاصل کر لے گا۔“ عدنان نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا ”یہ ہوئی ناں بات۔ مجھے یقین تھا اس مسئلے کا آپ ہی کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔ آپ واقعی کمال ہیں پڑی زاد صاحب.....“

اس وقت تو یحییٰ خاموش رہی، لیکن رات گئے اس کا نمبر میرے موبائل فون پر جھلکا ہے لگا "ہدیٰ زاد! میں آپ کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں، میں جانتی ہوں آپ میری خاطر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔" میں نے بات مذاق میں نالی۔ "میں بے وقوف لڑکی آتھیں نہیں جانتا کہ پراپرٹی کی قیمتیں آج کل آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ عدنان کا گھر لے کر میں نے کوئی گھائے کھا سوا نہیں کیا۔ دیکھ لیا، عدنان رقم چکا نہ۔ کا تو دس گنا زیادہ قیمت پر بیچ دوں گا۔ تم نے ہدیٰ زاد کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟" وہ ہنس پڑی۔ "آپ ہمیشہ گھائے کا سودے ہی کرتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، لیکن آپ کو میری شرط یاد ہے ناں۔ جب کبھی میں دیا دوا بار دیکھوں، تو میری جیبی نظر کے فریم میں آپ کو ضرور موجود رہنا ہوگا۔ بولیں، قبول ہے تو ٹھیک، ورنہ ابھی منع کرتی ہوں عدنان کو کہ گھر کے کاغذات نہ بنوائے آپ کے لیے۔" میں نے جلدی سے حامی بھری۔ "ٹھیک ہے ضدی لڑکی، مگر دیکھو، اب مزید کوئی بہانہ مت کرنا۔ جیسا تم چاہتی ہو، وہ یہاں ہوگا۔" میں نے یحییٰ کو تو تسلی دے دی، مگر دیر اور جتن و سکون ہمیشہ کے لیے ہوا ہو گیا۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر لان میں ٹھٹھا رہا کہ آنکھیں مل جانے کے بعد یحییٰ جب مجھے دیکھے گی، تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ صبح سویرے عدنان اپنے گھر کے کاغذات بنوا کر لے آیا۔ میں نے رقم کا چیک عدنان کے حوالے کیا، تو خوشی سے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ عدنان اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ "سنو عدنان....." وہ پلٹا تو میں نے اس کے گھر کے کاغذات اس کے ہاتھ میں تھمادیے۔ "یہ گھر تمہارا تھا، اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ میں نے صرف یحییٰ کو ممانے کے لیے یہ گھر خریدنے کا ڈراما کیا تھا۔ یحییٰ کی آنکھیں واپس آ جائیں، اس سے زیادہ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، البتہ یہ مکان والا راز یحییٰ کے لیے ہمیشہ راز ہی رہے گا۔" عدنان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ہدیٰ زاد صاحب! میں دن رات محنت کر کے آپ کی ایک ایک پائی واپس کر دوں گا۔ یقین چاہیے، یہ رقم مجھ پر ہمیشہ قرض رہے گی۔" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہمارا بھی اس لڑکی پر کچھ حق ہے ڈاکٹر صاحب، کچھ قرض ہم پر بھی واجب ہیں ابھی۔" عدنان جاتے جاتے ایک بار پھر پلٹا۔ "آپ کو میں ہر لمحے کی خبر دیتا رہوں گا۔ ہم اگلے مہینے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، مگر یحییٰ کی آنکھوں کی کٹی گھٹنے سے پہلے آپ کو بھی امریکا پہنچنا ہوگا، ورنہ وہ ضدی لڑکی آپ پریشن ہی نہیں کروائے گی۔ بہت مان دیتی ہے وہ آپ کو۔ اس نے آپریشن کے لیے "ہاں" بھی صرف آپ کے کہنے ہی پر کی ہے۔" میں نے عدنان کی آنکھوں میں تارے سے جھلکاتے دیکھے۔ اور یہ ستارے مجھے ہر بار اس کی آنکھوں میں تب دکھائی دیئے تھے، جب وہ یحییٰ کا ذکر کرتا تھا۔ "آپ جانتے ہیں ہدیٰ زاد صاحب۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جس دن یحییٰ جیبی بار یہ رنگین دنیا دیکھے گی، میں اسی دن اُسے شادی کے لیے پروپوز کر دوں گا۔ میں جانے کب سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔" میرے سر پر جیسے ساری عمارت دھڑام سے گر گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ "کیا..... میرا مطلب ہے کیا یحییٰ کو بھی اس بات کی خبر ہے؟" عدنان نے جیسے خوابوں کی بہتی سے جواب دیا۔ "ہاں، وہ بھی جانتی ہے کہ میں ہمیشہ سے اُسے اپنا ہم سفر بنانا چاہتا ہوں، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس دن یہ پروپوزل اس کے سامنے رکھوں گا۔ میری مرحومہ ماں اور میری خالہ کی بھی ہمیشہ ہی سے یہی خواہش تھی۔ بس اب وہ دن بھی قریب ہے۔ چلتا ہوں، بہت سے کام اُدھوڑے پڑے ہیں۔" عدنان پلٹ کر چلا گیا۔

میرا سر نرمی طرح پکڑا رہا تھا، میں وہیں کرسی ہی پر بیٹھ رہا ہوں۔ کچھ دیر میں کمائی کسی کام سے اندر آیا تو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں سر.....؟" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "کمائی! میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔" میں دروازے تک پہنچ کر کڑک گیا۔ کمائی ابھی تک مگم مگم سا کھڑا تھا۔ "کمائی! تم نے کہا تھا کہ کبھی تم نے بہت ٹوٹ کر کسی سے محبت کی تھی، تو کیا اس محبت کا کوئی رقیب بھی تھا؟" کمائی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "نہیں سر! خوش قسمتی سے رقابت کا زہر میں نے کبھی نہیں پیا۔ مگر سنا ہے کہ محبت کی اصل روح بھی ظاہر ہوتی ہے، جب کوئی رقیب درمیان میں پڑتا ہے۔" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کمائی سے پوچھا۔ "رقیب کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے کمائی؟" "رقیب کے ساتھ رقابت کرنی چاہیے سر۔ رقیب پر رحم کھانے والا دراصل اپنی محبت کے ساتھ غلط نہیں ہوتا۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "لیکن محبت تو محبت ہوتی ہے، کوئی جگہ نہیں۔" کمائی مسکرا دیا۔ "محبت میں رقابت سے بڑی جگہ بھلا اور کیا ہوگی، اس دنیا میں سر..... اور آپ نے سنا تو ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔" میں دفتر سے باہر نکلا تو رقابت کا زہر میرے پورے وجود میں اپنے پیچھے گاڑنا شروع کر چکا تھا۔ جانے کب دن ڈھلا اور کب رات ہوئی۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا۔ کبیر نے رات گئے جب گھر کے دروازوں اور گیٹ کو ٹالا لگا نے کی اجازت چاہی تو میری آنکھیں اس پر جم گئیں۔ "کبیر خان تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو.....؟" کبیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "ہم جان لے سکتا ہے اور جان دے بھی سکتا ہے صاحب....."

(جاری ہے)

بائیں ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، فلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بہنچن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سٹوڈنٹس میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہنا ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد بیست آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا ہوا سی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سٹوڈنٹس میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبیر خان کچھ دیر تک میرے جواب کا انتظار کرتا رہا ”آپ حکم کرو صاحب..... کبیر خان کا جان بھی حاضر ہے، آپ کے لیے“۔ میں اپنے خیالات سے چونکا ہاں..... فی الحال کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کچھ خیال آگیا تھا، تم جاؤ رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہاری گھر والی رات دیکھتی ہو گی تمہاری“۔ کبیر کچھ کہتے کہتے کبے ڈک گیا اور انہیں زندہ ساواہاں سے چلا گیا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اندر یہ کبھی عجیب سی ایک جنگ چھڑنے لگی تھی۔ جیسے میرا وجود دو حصوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہو۔ میرے اندر ایک نیا ”پری زاد“ جنم لینے لگا تھا، جو مجھے رقیب سے رقابت کے سبق سکھا رہا تھا۔ وہ سارا دن میرے اندر بول رہتا۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو! حق انسان، خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کا انتقام خوب کیا ہے تم نے، اب تمہاری رقم سے عدنان یعنی کی آنکھوں کا علاج کروائے گا اور پھر جب وہ لڑکی تمہیں اس شہزادے کے پہلو میں کھڑا دیکھے گی، توفیق کس کے حق میں ہو گا۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا عدنان نے، وہ بہت مان دیتی ہے مجھے، مگر صرف مان، عزت اور تعظیم۔ اور میں نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ جس جہنم کو میں اپنے مقدر کی پجوار سمجھا تھا، وہ تو اس کی عادت نکلا۔ چار دن اس نے مجھ سے جنس کربات کیا کر لی اور ذرا سا اپنا وقت مجھ پر صرف کیا کر دیا، میں تو اس کی محبت کا حق دار سمجھ بیٹھا تھا خود کو، احمقوں کی جنت کا سردار تھا میں۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا، اپنے اس سدا کے غدار دل کے ہاتھوں میں نے۔ میں وہ منافق تھا، جسے سو بار ایک ہی سوراخ سے ڈسما گیا۔ جی چاہو رہا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا سید چر کر اس بے وفا قلب کو باہر نکالوں اور اپنے قدموں تلے اس وقت تک روند تار ہوں، جب تک کہ زندگی کی آخری رقیب بھی ختم نہ ہو جائے۔

اگلے دن میں گھر سے نکلا تو جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور پھر ایک ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر ڈرائیور کو گاڑی اس طرف موڑنے کو کہہ دیا۔ میں کچھ دیر تہا بیٹھا چاہتا تھا اور کبھی کبھی تنہائی میں صرف لوگوں کے جہم ہی میں ملتی ہے۔ ویرانوں میں تو ہم اپنے سامنے مزید نمایاں ہو جاتے ہیں اور مجھے ایسی تنہائی چاہیے تھی، جہاں خود مجھے بھی میرا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لابی میں بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے گزر گئے۔ یہ پانچ اور سات ستارہ ہوٹل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک دنیا ایک خلقت وہاں آتی جاتی رہتی ہے، مگر کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے، مگر عموماً مسکرانے کی وجہ نامعلوم رہتی ہے، اچانک لابی میں ایک شور مٹا اٹھا اور کچھ لوگ ایک جانب لپکے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لپٹی اپنے اسٹاف کے ساتھ لابی میں داخل ہو رہی تھی۔ میڈم شپا رہ کے مداح اس سے آٹو گراف لینے میں مصروف تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لپٹی کی ساکھ بطور ہیروئن پھر سے بحال ہو چکی تھی۔ جانے یہ آٹو گراف لینے والے مداح بعد میں اس آٹو گراف کو سینٹ سنہال کر بھی رکھتے ہوں گے یا پھر وقت گزرنے کے بعد یہ یادیں بھی رڈی کی فو کری کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لپٹی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ سب سے معذرت کر کے میری طرف چلی آئی ”ارے پری زاد، تم.....؟ کیا کوئی میٹنگ وغیرہ ہے؟“ ”نہیں، خود سے ٹھنپنے کے لیے یہاں آ بیٹھا تھا۔“ میرا جواب سن کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ ”کیوں جلاتے رہتے ہو خود کو بیٹھ؟ کب تک چلتے رہو گے۔ یہ دنیا تمہارے اندر کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ پلیز، خود کو اس دنیا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو۔“ میں دھیرے سے مسکرایا ”گویا منافقت کا درس دے رہی ہو۔“ ”نہیں، پری زاد نہیں۔ مگر یہ دو غلامین ہماری فطرت بن چکا ہے۔ کمائی صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ تم ہمارے ساتھ کینیڈا نہیں جا رہے، کیا کوئی پریشانی ہے.....؟“ میں نے بات مانی ”نہیں، تم لوگ بہنچو، میں بعد میں آ جاؤں گا اور سنو، مجھے یقین ہے کہ یہ فلم تمہارے کیریئر کی بہترین فلم ہو گی۔ لیکن وعدہ کرو، پھر ہٹ ہو جانے کے بعد پہلا آٹو گراف میرے لیے ہو گا۔“ وہ ہنستے ہنستے رو پڑی۔ ”مت کیا کرو! کسی باتیں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ اور اگر میرا بس پلے تو ساری دنیا کو تم سے آٹو گراف لینے بھیج دوں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں تمہاری کتنی احسان مند ہوں پری زاد.....“ میں نے شکوہ کیا۔ ”پھر وہی احسان کی بات؟ کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ دوستی میں احسان نہیں ہوتا۔“ لپٹی کی آنکھیں ابھی تک نم تھیں۔ ”تم نہیں جانتے پری زاد! مجھ جیسے لوگ جو زندگی میں اُن گنت سمجھوتے کر کے یہاں تک پہنچتے ہیں۔ ان کے لیے کسی کا یہ بے لوث رویہ دنیا کے کسی بھی احسان سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہمارے ضمیر کو غم بھر کچھ کے لگا تار ہوتا ہے کہ بدلے میں ہم اپنے حسن کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائے اور یہ احساس بڑا بے سکون کر دینے والا ہوتا ہے۔“ لپٹی کے جانے کے بعد بھی میں بہت دیر تک بے مقصد وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اپنا موبائل فون خاموش کر دیا تھا۔ بے خیالی میں نظر پڑی تو کمائی اور یعنی سمیت بہت سے لوگوں کی کالز دکھائی دیں۔ عجیب عذاب ٹاشے ہے یہ سیل فون بھی، ہر وقت ہر کسی کی دسترس میں رکھتا ہے، کسی مضبوط جھکے جیسا۔

دفتر پہنچا تو پی اے نے بتایا کہ مینی بی بی کا ور جنوں بار فون آچکا ہے۔ اس نے ہانا پوچھے فون ملا دیا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ ”کہاں چلے جاتے ہیں آپ یوں بنانا۔ چار پانچ دن بعد میری روائگی ہے اور آپ ہیں کہ مجھے وقت ہی نہیں دے رہے۔ یاد رکھیں پری زاد، اگر آپ وقت پر نہ یوں پارک نہ پہنچے تو میں آپریشن نہیں کرواؤں گی اور اسے دھمکی سمجھے گا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ کچھ تنگ سا ہو گیا۔ ”نہ ہوا کرو میرے لیے اتنا پریشان۔ مجھ جیسے بے مول انسان کی اتنی فکر نہ کیا کرو۔ اور بہت لوگ ہیں یہاں تمہاری توجہ کے قابل۔“ مینی رو ہانسی ہو گئی۔ ”کیوں، کیا مجھے آپ کے لیے فکر کرنے اور پریشان ہونے کا حق بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جا رہی۔“ اس نے فون رکھ دیا اور پھر شام تک وہ بڑی مشکل سے مانی۔ جب انسان خود ہی سے روٹھا ہو تو اسے کسی دوسرے کو ماننا کتنا

مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اُس روز ہوا۔ تیسرے دن فلم یونٹ کینیڈا روانہ ہو گیا۔ میری بے چینی بھی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ میرے اندر پلٹنا پڑی زاد مجھے دن بھر کچھ کے لگا ہوا تھا۔ رقیب سے رقابت اور دشمنی سے دشمنی کی جاتی ہے اور تمہاری محبت کو تم سے چھین کر لے جانے والا تمہارا دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے پری زاد، یعنی کی آنکھوں کا آپریشن کروانے میں اتنی جلدی نہ کرو۔ پہلے اس عدنان نامی کانٹے کو نکل جانے دو۔ کاش عینی کو کبھی پینائی ہی نہ مل پائے۔ پری زاد کے لیے تو اس کی کوئلہ روح کی چاندنی ہی کافی ہے، غم بھرا اجالا کرنے کے لیے۔ اس کی پینائی کی ضرورت تو اس رقیب کو ہے اور رقیب کی خواہش پوری کرنے والا احق بھلا اس دنیا میں کون ہو گا۔ میں نے اس حکمران کی گونج سے، درد سے پھٹنے سر کو تھام لیا۔ اُسی وقت کبیر خان کسی کام سے دفتر میں داخل ہوا تو میرا زرد چہرہ اور پسینے سے شرابور وجود دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا صاب..... سب خیر تو ہے؟“ اور شاید ٹھیک وہی لمحہ تھا، جب میں اپنی برواشت کی حدیں یاد کر گیا۔ ”کبیر خان..... اور تمہارے علاقے میں اگر کوئی تم سے تمہاری محبت چھین کر لے جائے تو تم کیا کرتے ہو؟“ ”ہم اس کو قتل کر دیتے صاب..... ہمارا علاقے میں محبت اور فیرت کا نام پر مار دینا عام بات ہے۔“ میں نے اپنی آنکھیں زور سے بھیج لیں۔ ”کوئی میری محبت چھین کر لے جا رہا ہے کبیر خان۔ اس کو بھی ختم کر دو“ کبیر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ ”تم صرف اس کا نام بولو صاب..... چو میں گھٹنے میں وہ اس دنیا سے چلا جائے گا۔“ میں نے ایک کانڈ کے رختے پر عدنان کا نام اور پتا لکھ کر کبیر کے حوالے کر دیا۔ ”یہ لڑکا آج کل زیادہ تر مینی بی بی کے گھری پر رہتا ہے۔ دھیان رہے۔ یہ کام تب ہونا چاہیے جب وہ لڑکا تمہا ہو۔“ کبیر نے سر ٹھکا دیا۔ ”آپ فکر مت کرو صاب۔ ہم سمجھ گیا۔“ کبیر کسی اچھے وفادار کی طرح زیادہ سوال جواب کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

میرے سینے پر رکھا ایک بھاری پتھر بنا تو ضمیر کے پوچھ کی دوسری بڑی اور اس سے بھی بھاری سہل پورے وجود کو کچلے گئی۔ یہ ہم جیسوں کا ضمیر اتنا زندہ کیوں رہتا ہے؟ یہاں تو لوگ ہل بھر میں نیکوں گھرا جاز دیتے ہیں اور پلٹ کر ذرا دیر رک کر دیکھتے بھی نہیں۔ میں تو پھر بھی صرف اپنے دل کا آئینہ آباد کرنا چاہتا تھا۔ کب چاہتا تھا، میں نے کہ ایسا ہو، گھبرا ہوا رہتا تھا، تو اس میں میرا قصور کیا تھا؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ضمیر ہمیں گناہ کرنے سے روکتا نہیں۔ صرف گناہ کا مزہ کر کرنا کرتا ہے۔ میں تو وہ بے ہمت تھا کہ نہ نیکی کو نیکی کی طرح ادا کر سکا اور نہ گناہ کو گناہ کی طرح بھاپایا، کیوں کہ چاہے گناہ ہو یا پھر ثواب، دونوں کے لیے بہر حال ظرف کی ضرورت پڑتی ہے۔ شام کو دفتر سے نکلنے سے پہلے مجھے عینی کا پیغام ملا کہ وہ بیرون ملک روانگی سے قبل اپنے مجسموں کی ایک نمائش رکھ چکی ہے، جس کا آج ہی افتتاح ہے۔ لہذا میں دفتر سے سیدھا شہر کی بڑی آرٹ گیلری پہنچ جاؤں۔ مجھے لگا، جیسے عدنان کو راستے سے بنانے میں قدرت خود میری مدد کرنا چاہتی ہے۔ یعنی بہت دیر تک اپنی مصروفیت میں الجھی رہے گی اور کبیر خان کو وار کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ میرے سارے جسم میں بیڑیاں سی ریگتے لگیں۔ جرم کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے اور جب کوئی نادان جرم کرنے کی فہان لے تو پھر یہ نشہ سرچڑھ کر بولتا ہے اور شاید دنیا کے ہر گناہ کے پیچھے یہی فلسفہ کار فرما رہتا ہے۔

آرٹ گیلری لوگوں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ کمالی بھی دفتر میں عینی کی دعوت پر میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ قریب کا مہمان خصوصی بھی مجھے ہی مقرر کیا گیا ہے۔ میں نہ نہ کرنا رہ گیا، مگر جھٹ فیت کانٹے والی فٹیشی میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ فیت کانٹا تو تالیوں کی گونج میں ہم اس ہال میں داخل ہو گئے، جہاں عینی کے بنائے ہوئے بہت سے فن پارے رکھے گئے تھے۔ میں نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، مگر مجھے عدنان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میرے دل کے چور نے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ میں عینی سے اس کے بارے میں پوچھ سکوں۔ اس لڑکی کی آنکھوں کا نثر سارے ہال میں بکھرا ہوا تھا اور اس کے فن کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا۔ لوگوں نے جی بھر کر اُسے داد دی۔ مغرب کے بعد باقاعدہ قریب کا آغاز ہوا، تو میں نے کبیر خان کو ہال سے باہر جاتے دیکھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑا تھا کہ ایک مینی غشی سی لڑکی ایک پختہ عمر عورت کے ساتھ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ”کیسے ہیں پری زاد صاحب، کبھی غریبوں کو بھی یاد کر لیا کریں۔ آپ نے توشہ پارہ کے بعد کسی اور فلمی ہیروئن کو دیکھا تک نہیں۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کمالی نے جلدی سے تعارف کر دیا۔ ”مریہ میڈم دارا ہیں۔ شہ پارہ کی ٹکر کی ہیروئن ہیں۔“ زار نے انکساری سے سر جھکا یا۔ ”کہاں جی..... شہ پارہ کی ٹکر کی ہوتی تو آج میں بھی پری زاد صاحب کی کسی فلم میں کاسٹ ہوتی، مگر انہوں نے تو ہمیں پوچھا تک نہیں۔“ کوئی اور موقع ہوتا تو میں شاید اس کی بات اطمینان سے سنتا، مگر اس وقت میرا سارا دھیان کبیر اور عدنان کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے جان بچھڑانے کے لیے کہا ”اگر میں نے کوئی دوسری فلم بنائی، تو آپ کو ضرور موقع دوں گا۔ فی الحال میں کسی اور الجھن میں ہوں۔ معاف کیجیے گا۔“ کمالی نے میرے بٹنے کے بعد جانے بات سنبھالنے کے لیے اس خُسن بے پردا کو کیا کہا۔ میں ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہو کر بظاہر ایک فن پارہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کمالی ہاتھ میں ایک تعارفی کارڈ لیے میری طرف آ گیا۔ ”مرا یہ زار نے اپنا کارڈ دیا ہے اور اس کے پیچھے اپنا ”خاص“ نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کبھی آپ ان کے ساتھ بھی دُزر وغیرہ کریں۔“ میں نے کارڈ دیکھ کر بے پروائی سے کمالی کے حوالے کر دیا۔ وہ کچھ حیران ہوا۔ ”تم جاننے ہو کمالی اچھے ایسے لوگوں سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ خُسن جب خود اپنی قیمت لگانے پر مائل جائے تو بیک وقت اس سے زیادہ گراں اور زراں جنس زمانے میں کوئی دوسری نہیں ہوتی۔“ کمالی مسکرایا۔ ”یہ آپ ہی ہیں، جو اس جنس کو زراں سمجھ رہے ہیں عرو، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی شہر بھر کے امرا وہی زار کے ساتھ لٹچ یا دُزر امرا وقت گزارنے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا مگر کہ جب خُسن اپنی قیمت لگانے پر آجائے تو اس سے مہنگی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی۔“ میں نے سر جھکا۔ ”وہ خُسن ہی کیا جو بک جائے۔“ ٹھیک کہتے ہیں مگر آپ، مگر بات اگر سو دے بازی کی ہو تو خُسن کے پاس وہان کرنے کے لیے سب سے بڑا عطیہ خُسن ہی ہو جاتا ہے۔ شاید آپ جسے بہت مقدس جنس سمجھتے ہیں، زار اچھی اور فروش کے ہاں وہی سب سے آسان سودا ہے۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے عرو۔ کسی کے لیے دولت کے انبار، رڈی کا گنڈ کے ٹکڑوں جیسے ہیں، تو کسی کے لیے خُسن اور اور اس رُدی کا نعم البدل۔“ اتنے میں دوسرے ہال سے اہتیکر پر قریب شروع ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سارے مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں پہلی رومیں اپنے نام والی نشست پر بیٹھا تو اچانک میری نظر اسٹیج کے پیچھے اپنے کاموں میں مصروف عدنان پر پڑی۔ میں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا تو کبیر خان مجھے ہال کے دروازے پر جما کھڑا نظر آیا۔ میری اُس سے نظری، تو اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔